جنوری Jan. 2022

Urdu Monthly
SADA E SHIBLI
Hyderabad
ISSN: 2581-9216

ماہنامہ

صدائے شبلی

حیدرآباد

ایڈیٹر مولانا ڈاکٹر محمد محامد ہلال اعظمی

قیمت: -/20 روپے

www.shibliinternational.com

ماہنامہ
حیدرآباد

صدائے شبلی

Monthly
Hyderabad

SADA E SHIBLI

Issue:47 شمارہ Vol:4 جلد Jan 2022 جنوری

مدیر:

ڈاکٹر محمد محامد ہلال اعظمی

نائب مدیران:

ڈاکٹر عبدالقدوس

ڈاکٹر سراج احمد انصاری

ابو ہریرہ یوسفی

قیمت فی شمارہ:	20/-
سالانہ:	220/-
رجسٹرڈ ڈاک:	350/-
بیرونی ممالک:	50/-امریکی ڈالر
خصوصی تعاون:	2000/-

SADA E SHIBLI
A/c: 1327102000023922
Ifsc: IBKL0001327
IDBI Bank: CHARMINAR HYD, T.S

Email: sadaeshibli@gmail.com

Mob: 9392533661 - 8317692718

ماہنامہ ''صدائے شبلی'' حیدرآباد میں مقالہ نگاران سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے

مجلس مشاورت:

پروفیسر اشتیاق احمد ظلی۔ پروفیسر مظفر علی شہ میری
پروفیسر محسن عثمانی ندوی۔ پروفیسر ابوالکلام
پروفیسر شاہد نوخیز اعظمی۔ ڈاکٹر محمد الیاس اعظمی
مفتی محمد فاروق قاسمی۔ مولانا ارشاد الحق مدنی
مولانا محمد مساعد ہلال احیائی
اعجاز علی قریشی ایڈوکیٹ۔ محمد سلمان انجینئر

مجلس ادارت:

ڈاکٹر محمد رفیق۔ ڈاکٹر حمران احمد۔ ڈاکٹر ناظم علی
ڈاکٹر مختار احمد فردین۔ ڈاکٹر غوثیہ بانو
ڈاکٹر سید امام حبیب قادری۔ ڈاکٹر سید اسرار الحق سبیلی
ڈاکٹر سمیہ تمکین۔ ڈاکٹر صالحہ صدیقی
ڈاکٹر فاروق احمد بھٹ۔ ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان
ڈاکٹر مظفر علی ساجد۔ مولانا عبدالوحید ندوی
مولانا احمد نور عینی۔ ابو ہریرہ ایوبی۔ محسن خان

ہر طرح کی قانونی چارہ جوئی صرف حیدرآباد کی عدالت میں ہوگی

محمد محامد ہلال (اونر، پبلشر، پرنٹر، ایڈیٹر) نے دائرہ الیکٹرک پریس میں چھپوا کر حیدرآباد تلنگانہ سے شائع کیا

خط و کتابت کا پتہ

MOHD MUHAMID HILAL #17-6-352,
B1, 2nd Floor,Bafana Complex,
Dabirpura Road, Purani Haveli,
Hyderabad- 500023. T.S

فہرست مضامین

۱	اپنی بات	ڈاکٹر محمد محامد ہلال اعظمی	۵
۲	اخلاقِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم	علامہ شبلی نعمانیؒ	۶
۳	امت کے مسائل کا حل قرآن وسنت کی روشنی میں	مولانا حبیب الرحمٰن	۷
۴	سرسید احمد خاں اپنے اخلاقی اور اصلاحی مضامین کی روشنی میں	ڈاکٹر ولاء جمال العسیلی	۱۰
۵	سالِ نو (نظم)	شاہ نواز ہاشمی	۱۵
۶	ادا جعفری کی شعری کائنات کا فکری وفنی مطالعہ	ڈاکٹر محمد انور	۱۶
۷	غزل	قمر صدیقی	۱۹
۸	غزل	سید نوید جعفری	۱۹
۹	اردو کے فروغ میں مولانا محمد خواجہ شریف کا حصہ	محمد خواجہ محی الدین	۲۰
۱۰	غزل	جہانگیر قیاس	۲۲
۱۱	راجہ گردھاری پرشاد باقی بحیثیت شاعر	نہا نورین	۲۳
۱۲	رباعی کائنات کا فر وقلندر، حافظ کرناٹکی	خوشبو پروین	۲۶
۱۳	غزل	محمد نعیم کوثر رشادی	۳۰
۱۴	آن لائن ہوتی زندگی، آف لائن ہوتے رشتے	سیدہ تبسم منظور	۳۱
۱۵	تبسم فاطمہ کے افسانوں کا تنقیدی جائزہ	تنظیم فاطمہ	۳۴
۱۶	چراغ (نظم)	نیاز جیراج پوری	۳۷
۱۷	تصانیفِ شبلی کے تراجم (تبصرہ)	مبصر: ڈاکٹر محمد طارق ایوبی	۳۸

ماہنامہ ''صدائے شبلی'' کے خصوصی معاونین

جناب ابوسفیان اعظمی، مقیم حال ممبئی جنا محمد یوسف بن الحاج محمد منیر الدین عرف ولی مرحوم، حیدرآباد

مفتی محمد فاروق قاسمی۔صدر علماء کونسل وجے واڑہ، آندھرا پردیش

ڈاکٹر سید جلیل حسین ایم ڈی (علیگ) ٹولی چوکی حیدرآباد

مولانا منصور احمد قاسمی، معین آباد، تلنگانہ

الحاج رئیس احمد اقبال، انجینئر صدر سہارا ویلفیئر سوسائٹی، حیدرآباد

الحاج محمد زکریا انجینئر (داماد استاذ الاساتذہ حضرت عبدالرحمٰن جامیؒ) مقیم حال دبئی

ڈاکٹر شہباز احمد، پروفیسر گورنمنٹ نظامیہ طبی کالج چارمینار، حیدرآباد

مولانا محمد عبدالقادر سعودی نائس جوس سینٹر سکندرآباد، حیدرآباد

الحاج محمد قمر الدین، نبیل کالونی بارکس حیدرآباد

الحاج محمد عبدالکریم۔صدر مسجد اشرف کریم کشن باغ، حیدرآباد

اپنی بات

ہم نے اکیسویں صدی کا ایک سال اور مکمل کر لیا۔ گزرے ہوئے سال کا محاسبہ کرنا دانش مندی ہے۔ ہم اگر محاسبہ کرتے ہیں تو ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ ہم نے کھویا بہت ہے اور پایا کم ہے۔ بلاشبہ ہمارے ملک کا ہر شعبہ مختلف زاویہ سے انحطاط کا شکار ہے، اس سے نکلنے کی کوئی فوری تدبیر بھی سامنے نہیں آرہی ہے۔ کیونکہ انسان اقتدار اور دولت کی ہوس میں یا تو متشدد ہو چکا ہے یا تو متعصب اور ہمارے ملک کی موجودہ صورتِ حال میں محبت، اتحاد، انصاف، درگزر، مساوات وغیرہ کی باتیں کم ہوتی ہیں، بیشتر باتیں غیر ضروری، فتنہ فساد، بغض وعناد، تقسیم در تقسیم کے فارمولے پر اترتی ہوئی نظر آتی ہیں، جس سے ملک کا مستقبل تاریکی میں جاتا ہوا نظر آتا ہے۔

سالِ رواں میں کئی ریاستوں میں اسمبلی الیکشن ہے، اس میں بالخصوص صوبہ اتر پردیش ہے۔ یہ صوبہ بڑا اور سارے ملک پر اثر انداز ہے اور کہا بھی جاتا ہے کہ مرکز کا راستہ اسی صوبہ سے ہو کر جاتا ہے۔ تمام سیاسی پارٹیاں الیکشن میں حفظ ماتقدم کے طور پر میدانِ عمل میں آچکی ہیں۔ الکٹرانک میڈیا، سوشل میڈیا، برقی ورقی صحافت سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ اب الیکشن مذہب کے نام پر ہو رہا ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ تمام ہندو متحد ہو جائیں۔ کیونکہ وہ اسّی فیصد ہونے کے بعد بھی خطرے میں ہیں اور کوئی کہتا ہے کہ اس ملک میں سب سے بڑی اقلیت مسلمان خطرے میں ہے۔ اس وجہ سے سارے مسلمان ایک ہو جائیں اور اکثر کی زبان پر یہ بھی ہوتا ہے کہ اس ملک کے چار سپاہی ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی آپس میں ہیں بھائی بھائی۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو ان سیاسی لوگوں کی وجہ سے ہمارا ملک خطرے میں ہے اور ملک ترقی کی راہ سے تنزلی کی طرف جا رہا ہے۔ اب بھی وقت ہے سوچ بدلنے کی، تاکہ ہمارے ملک کی حالت بدل جائے۔ ہمارے ملک کو تعلیم، میڈیکل، سائنس، بزنس نوکری اور بھائی چارہ کی ضرورت ہے۔ انہیں راستوں میں مرکزی اور ریاستی حکومتوں کو کام کرنا چاہئے۔ میڈیا اور عوام کو بلاتفریق ومذہب وملت کے بالا باتوں کے بارے میں بات کرنی چاہئے اور ہر اس بیان کا یا عمل کا جو ملک میں نفرت پھیلائے، اس کی سب کو سختی سے مخالفت کرنی چاہئے۔ کیونکہ چنگاری کو اگر بجھا دیا جائے تو شعلہ نہیں بنے گی اور اگر نہیں بجھایا گیا تو وہ شعلہ بن کر سب کو جلا ڈالے گی۔

سال گزشتہ میں بہت سی عالمی شخصیات اس جہانِ فانی سے کوچ کر گئیں، انہیں میں مشہور ومقبول مصنف مولانا یوسف اصلاحیؒ تھے۔ ان کی تحریریں نصف صدی سے لوگوں کے اذہان میں انمٹ نقوش چھوڑ رہی تھیں اور ان شاء اللہ تا قیامت چھوڑتی رہیں گی۔ اللہ رب العزت ان کے درجات کو بلند فرمائے آمین، اور اس امت کو ان کا نعم البدل عطا فرمائے آمین۔

انڈو عرب کی ممتاز شخصیت محترم سید وقار الدین ایڈیٹر رہنمائے دکن حیدرآباد بھی سال گزشتہ کے ماہ دسمبر میں داغِ مفارقت دے بیٹھے۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے اور جنت الفردوس عطا فرمائے آمین۔ ادارہ شبلی انٹرنیشنل ایجوکیشنل ٹرسٹ حیدرآباد بالا دونوں مرحومین کی بلند خدمات پر خراجِ عقیدت پیش کرتا ہے اور اس امید کے ساتھ کہ ہر رات کے بعد ایک نئی صبح ہوتی ہے۔

شبلی انٹرنیشنل ایجوکیشنل ٹرسٹ حیدرآباد کی ۳۲۷ گز اراضی پر مدرسہ، مصلّٰی، ریسرچ سینٹر کے لیے تعمیری کام جاری ہے۔ پہلا چھت الحمد للہ اہل خیر حضرات کے تعاون سے پڑ چکا ہے۔ ادارہ تعمیری کام میں حصہ لینے کی گزارش کرتا ہے۔ جزاک اللہ احسن الجزاء۔

محمد محامد ہلال اعظمی

اخلاقِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم

علامہ شبلی نعمانیؒ

آنحضرت ﷺ کے صاحبزادے حضرت ابراہیم نے جس روز انتقال کیا، اتفاق سے اس روز سورج گرہن لگا، لوگوں کے خیال میں ایک پیغمبر کی ظاہری عظمت کا فرضی تخیل یہ تھا کہ اس دردوصدمہ سے کم از کم اجرام سماوی میں انقلاب پیدا ہوجائے، لوگوں نے اس اتفاقی واقعہ کو اسی قسم کے واقعہ پر محمول کیا، ایک جاہ پسند انسان کے لیے اس قسم کا اتفاق بہترین موقع ہوسکتا تھا لیکن نبوت کی شان اس سے بدرجہا ارفع واعلا ہے، آنحضرت ﷺ نے اسی وقت لوگوں کو مسجد میں جمع کیا اور خطبہ دیا کہ چاند اور سورج میں گرہن لگنا خدا کی آیاتِ قدرت میں سے ہے، کسی کی زندگی اور موت سے ان میں گرہن نہیں لگتا۔

(ایک دفعہ آنحضرت ﷺ وضو کررہے تھے، وضو کا پانی جو دستِ مبارک سے گرتا، فدائی برکت کے خیال سے اس کو چلّو میں لے کر بدن میں مل لیتے، آپؐ نے پوچھا کہ تم یہ کیوں کررہے ہو، انہوں نے عرض کیا کہ خدا اور خدا کے رسول کی محبت میں، فرمایا، اگر کوئی اس بات کی خوشی حاصل کرنا چاہے کہ وہ خدا اور خدا کے رسول سے محبت رکھتا ہے تو اس کو چاہئے کہ جب باتیں کرے سچ بولے، جب امین بنایا جائے ادائے امانت کرے اور کسی کا پڑوسی ہے تو ہم سائیگی کو اچھی طرح نباہے۔

ایک صاحب بارگاہِ نبوت میں حاضر ہوئے، اثنائے گفتگو میں انہوں نے کہا ''جو خدا چاہے اور جو آپؐ چاہیں''۔ ارشاد ہوا ''تم نے خدا کا شریک اور ہم سر ٹھہرایا کہو کہ جو خدا تنہا چاہے)

شرم وحیا: (صحاح میں ہے کہ آپؐ دوشیزہ لڑکیوں سے بھی زیادہ شرمیلے تھے، شرم اور حیا کا اثر آپ کی ایک ایک ادا سے ظاہر ہوتا تھا، کبھی کسی کے ساتھ بدزبانی نہیں کی، بازاروں میں جاتے تو چپ چاپ گزر جاتے، تبسم کے سوا کبھی لب مبارک خندہ وقہقہہ سے آشنا نہیں ہوئے۔)

بھری محفل میں کوئی بات ناگوار ہوتی تو لحاظ کی وجہ سے زبان سے کچھ نہ فرماتے، چہرہ کے اثر سے ظاہر ہوتا اور صحابہؓ متنبہ ہوجاتے۔

عرب میں اور ممالک کی طرح شرم وحیا کا بہت کم لحاظ تھا، ننگے نہانا عام بات تھی، حرم کعبہ کا طواف ننگے ہوکر کرتے تھے، آنحضرت ﷺ کو بالطبع یہ باتیں سخت ناپسند تھیں، ایک دفعہ فرمایا کہ حمام سے پرہیز کرو، لوگوں نے عرض کی کہ حمام میں نہانے سے میل چھوٹتا ہے اور بیماری میں فائدہ ہوتا ہے، ارشاد فرمایا کہ نہاؤ تو پردہ کرلیا کرو، عرب میں حمام نہ تھے لیکن شام وعراق کے جو شہر عرب کی سرحد سے ملے ہوئے تھے، وہاں کثرت سے حمام تھے، اس بنا پر آپؐ نے فرمایا کہ تم جب عجم فتح کروگے تو وہاں حمام ملیں گے، ان میں جانا تو چادر کے ساتھ جانا۔

(سیرۃ النبیؐ، جلد: دوم، ص: ۲۶۸/۲۶۹)

مولانا حبیب الرحمن۔حیدرآباد

اُمت کے مسائل کا حل قرآن وسنّت کی روشنی میں

كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَّاحِدَةً ۔ فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ ۔ وَاَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيْمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ ۔ وَمَا اخْتَلَفَ فِيْهِ اِلَّا الَّذِيْنَ اُوْتُوْهُ مِنْ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ بَغْيًا بَيْنَهُمْ ۔ فَهَدَى اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ مِنَ الْحَقِّ بِاِذْنِهٖ ۔ وَاللّٰهُ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۳۱۲

ترجمہ: انسان ابتداء میں ایک ہی اُمت (ایک ہی طریقے پر) تھے، پس اللہ نے نبیوں کو مبعوث فرماتا رہا جو خوشخبری دیتے تھے اور ڈراتے تھے، اور نازل کیا اُن کے ساتھ کتاب حق کیساتھ تا کہ لوگوں کے درمیان فیصلہ کردیں جس میں انہوں نے اختلاف کیا، اور اس میں اختلاف نہیں کیا مگر ان ہی لوگوں نے جن کو (کتاب) دی گئی تھی بعد اس کے کہ جب ان کے پاس کھلی ہدایات (واضح احکام) آچکے تھے محض باہمی ضد کی وجہ سے، پس اللہ نے اہلِ ایمان کی اس حق کے معاملہ میں اپنے حکم سے رہنمائی فرمائی جس میں انہوں نے اختلاف کیا، اور اللہ جس کو چاہتا ہے صراطِ مستقیم کی طرف ہدایت دیتا ہے۔

تشریح: جو کتابِ الٰہی پر سچا ایمان رکھتے تھے، پس وہی لوگ ایمان لائے اور کتابِ الٰہی کی روشنی میں پیدا کردہ اختلافات کے غلط ہونے کو محسوس کرتے ہوئے ہدایت پر چلنے کی کوشش کرتے رہے۔ ہدایت حاصل کرنے کا یہی الٰہی قانون ہے، یعنی جو واقعی دوزخ سے بچنے کیلئے کتابِ الٰہی سے ہدایت کی راہ معلوم کرنا چاہتے ہیں، اُن کو ہدایت کی راہ ضرور معلوم ہوجاتی ہے (الرعد ۲۷، الشوریٰ ۱۳)۔

اس آیت کی رُو سے ایمان والوں پر لازم ہوجاتا ہے کہ وہ اپنے اختلافات جو روایات کی بناء پر پیدا ہوگئے ہیں، اُن کو قرآن کی ہی روشنی میں دور کرنے کی کوشش کر کے اُمتِ واحدہ بنیں، جیسا کہ سورہ النحل ۶۴ میں ارشاد ہے "اور ہم نے تم پر کتاب صرف اس لئے نازل کی ہے کہ تم ان کو وہ چیز کھول کر بتادیں جس میں وہ اختلاف کررہے ہیں، اور وہ (قرآن) ہدایت اور رحمت ہے ان لوگوں کیلئے جو ایمان لاتے ہیں" کیونکہ اُمتِ واحدہ بننے کی کوشش کرنا ایمان والوں پر اسی طرح لازمی وضروری ہے جس طرح قرآن سے ہدایت حاصل کرنا لازمی وضروری ہے، چنانچہ فرمایا "پس اللہ اگر چاہتا تو تم سب کو ایک ہی راہ پر جمع کردیتا" یہ بات النحل ۹ میں بھی فرمائی گئی ہے اور سجدہ ۱۳ میں فرمایا "اگر ہم چاہیں تو ہر نفس کو ہدایت دے دیتے" ان تینوں آیات سے ثابت ہوجاتا ہے کہ آخرت میں کامیابی حاصل کرنے اور آگ کی ابدی زندگی یعنی دوزخ سے بچنے کیلئے دنیا کی زندگی کو امتحان گاہ بنایا گیا ہے، اب یہاں دنیا میں جو عمل کرے گا، اُسی عمل کا بدل پائے گا، لہٰذا سامانِ ہدایت (قرآن) سے ہدایت حاصل کرنے کی کوشش کرنا ہر ایمان والے کا کام ہے اور جو ایسا نہیں کرے گا اُس کو دنیا میں سزا، ذلت ومحتاجی کی زندگی اور مرنے کے بعد ابدی عذاب ہوگا۔

یہ ایک اٹل حقیقت ہے کہ ہدایت ایک ہی ہے اور نہیں۔ اس سے ثابت ہوا کہ ہدایت پر چلنے والی جماعت ایک ہی ہوگی (اُمتِ واحدہ)۔ اُمتِ واحدہ بننے کیلئے جن بنیادی باتوں کی ضرورت ہے وہ سب دینِ اسلام میں موجود ہیں، مثلاً تمام انسان آدمؑ وحواؑ کی اولاد ہیں جن کی ضروریات' حاجات' جذبات وخواہشات بھی نہ صرف ایک ہی ہیں بلکہ اُن کو پورا کرنے کا سامان' اسباب وقوانین بھی ایک ہی ہیں، ان کا خالق' معبود' پروردگار بھی ایک ہی ہے جس نے ان کیلئے ایک ہی طریقۂ زندگی و بندگی (دینِ اسلام) تجویز کردیا ہے۔

وہ آیات پیش ہیں جن میں اُمتِ واحدہ بننے کا تاکیدی حکم دیا گیا:

۱) اور اگر اللہ چاہتا تو یقیناً تم سب کو ایک ہی اُمت بنادیتا (المائدہ ۴۸)۔ بغرض غور وفکر اس آیت کا خلاصہ پیش ہے ''اور ہم نے (اے پیغمبر) تمہاری طرف ایسی کتاب حق کے ساتھ نازل کردی ہے جو تصدیق کرنے والی ہے پچھلی کتابوں کی اور اُن کی تعلیمات کی محافظ ہے، پس تم اُن کے درمیان اُس کتاب کی روشنی میں فیصلہ کرو جو اللہ نے نازل کیا ہے، تمہارے پاس حق آجانے کے بعد اُن کی خواہشات کی پیروی مت کرو، ہم نے تم میں سے ہر ایک کیلئے ایک ہی شریعت (ایمان وعقائد اور انجامِ آخرت کے قوانینِ الٰہی) اور منہج (انسانوں کے دنیاوی ضروریات کو پورا کرنے کیلئے موقع ومحل کے لحاظ سے حکمت ومصلحت کے تحت اللہ کے دیئے ہوئے احکام) مقرر کیا ہے (کیونکہ تم سب کی نسل ایک ہی ہے) اور اگر اللہ چاہتا تو خود ہی سب کو ایک ہی اُمت بنادیتا (یہ بندوں کا کام ہے کہ وہ خود ہی ایک اُمت بنیں) مگر اللہ کا قانون یہ ہے کہ اس کے دیئے ہوئے احکام میں تمہاری آزمائش کرے، پس تم بھلائیوں کی طرف دوڑو، آخر کار تم سب کو اللہ ہی کی طرف پلٹ کر جانا ہے، پھر وہ تم کو بتادے گا جن باتوں میں تم اختلاف کرتے تھے'' یہاں قرآن کو تمام پچھلی کتابوں کا محافظ فرما کر قرآن ہی کے مطابق ان کے معاملات کا فیصلہ کرنے کا حکم دینا ثابت کردیتا ہے کہ پچھلی اُمتوں کی شریعت ایک ہی تھی اور حقیقتِ واقعہ اس کے خلاف ہوتا تو ان کے معاملات کا فیصلہ قرآن سے کرنے کا حکم نہیں دیا جاتا۔

قربانی کا طریقہ ہر ایک کے پاس ہر زمانے میں ایک ہی رہا ہے (الحج ۳۴ اور ۶۷) اسی طرح ہر اُمت کیلئے نماز وزکوٰۃ کا طریقہ بھی۔ اس لئے الگ الگ شریعت کی بات غیر صحیح قرار پاتی ہے۔

۲) ہود ۱۱۸ میں فرمایا ''اگر تیرا رب چاہتا تو تمام انسانوں کو ایک اُمتِ بنادیتا'' یہی بات النحل ۹۳ میں بھی اس تنبیہ کے ساتھ بیان کی گئی ہے کہ دنیا میں اُمتِ واحدہ بننے یا جماعت وفرقہ بنانے کے معاملے میں جو کام کرو گے اُن کے متعلق تم سے ضرور پوچھا جائے گا۔

۳) انبیاء ۹۲ میں فرمایا تمام پیغمبر اور اہلِ ایمان ایک ہی اُمت ہیں۔ مومنون ۵۲ میں تمام رسولوں کو ایک ہی اُمت فرمایا گیا ہے کیونکہ تمام انبیاء ورُسُل کے ایمان وعقائد اور فکرِ آخرت کی تعلیم وتربیت اور دعوتِ حق پہنچانے کا طریقۂ کار ایک ہی رہا ہے۔ الشوریٰ ۱۳ میں فرمایا گیا ''نوح سے لیکر نبی کریم ﷺ تک دین کا ایک ہی طریقہ (شرع) مقرر کیا گیا۔

وہ آیات پیش ہیں جن میں اختلاف وتفرقہ پیدا

کرنے والوں کو عذاب دیا جائے گا۔

۱) آل عمران ۱۰۳ میں فرمایا کہ تم سب اللہ کی رسی (قرآن) مل کر تھام لو، اور آپس میں تفرقہ مت پیدا کرو۔ آل عمران ۱۰۵ میں تفرقہ پیدا کرنے سے منع کرتے ہوئے فرمایا کہ اس کی خلاف ورزی کرنے والوں کیلئے بُرا عذاب ہے۔ الانعام ۶۵ میں فرمایا اگر تمہارے عقائد میں شرک ہوگا تو تم کو گروہ گروہ کر کے آپس میں لڑا دے گا (ایک کو دوسرے کی طاقت کا مزہ چکھائے گا)۔ الانعام ۱۵۹ میں فرمایا کہ جن لوگوں اپنے دین (شریعت) میں تفرقہ ڈالا (اختلافات کیئے) اور گروہوں میں بٹ گئے ان سے اے پیغمبر آپ کا ہرگز کوئی تعلق نہیں ہے۔

۲) اعراف ۱۶۸ میں فرمایا جو ایمان کے تقاضے کو پورا کرنے کی کوشش نہ کریں گے اور اللہ کے بندوں کو دوزخ سے بچنے کی دعوت نہ دیں گے تو بطور سزا کے وہ دنیا میں گروہ در گروہ کر دیئے جائیں گے، یعنی خود ہی جماعتیں اور فرقے بنا بنا کر بٹ جائیں گے۔ الانبیاء ۹۳ میں فرمایا کہ ایمان کے دعویدار اپنے دین میں اختلافات پیدا کر لئے ان سب کو ہمارے پاس لوٹ کر آنا ہے۔ النحل ۹۲ میں فرمایا گیا کہ جو کچھ تم اختلاف کرتے تھے وہ حشر کے دن تم کو بتا دیا جائے گا اور ۹۳ میں فرمایا کہ اگر اللہ چاہتا تو تم کو ایک ہی اُمت بنا دیتا اور تم ضرور پوچھے جاؤ گے تمہارے اپنے ان اعمال کے بارے میں جو تم اُمتِ واحدہ بننے میں یا اس کے بکھر جانے کیلئے جو کچھ کیئے ہوں گے۔

۳) مؤمنون ۵۳ میں فرمایا کہ ایمان والے اپنے دین میں اختلاف کر کے گروہوں میں بٹ گئے اور ہر گروہ اس خیال میں مگن ہے کہ وہی ہدایت پر ہے، یہی بات الروم ۲۵ میں بھی فرمائی گئی ہے۔

۴) اور الشوریٰ ۱۴ میں ہے کہ اللہ کی طرف سے علم آجانے کے بعد محض ضد اور ہٹ دھرمی کی بناء پر اختلاف کرنے والوں کے متعلق فرمایا کہ اگر پہلے سے طے نہ کر دیا گیا ہوتا (حشر کے دن فیصلہ کے بعد سزا دی جائے گی) تو ان کے اختلاف کرنے پر فوراً عذاب دے دیا جاتا۔

مندرجہ بالا ارشاداتِ الٰہی کے علاوہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے کہ پچھلی اُمتیں (۷۲) فرقوں میں بٹی اور میری اُمت (۷۳) فرقوں میں بٹ جائے گی، سب کے سب دوزخی ہوں گے سوائے ایک کے، تو صحابہؓ نے پوچھا: نجات پانے والا کونسا فرقہ ہے تو آپؐ نے فرمایا کہ میں جس طریقہ پر ہوں اور میرے اصحابؓ جس طریقہ پر ہیں وہی نجات پائے گا (سنن ترمذی، کتاب الایمان، باب: اُمت میں افتراق کے متعلق)۔ یہ ارشادِ رسولؐ دراصل سورہ النساء ۱۱۵ کے تحت فرمایا گیا ہے۔

الغرض اللہ و رسول ﷺ کے مندرجہ بالا ارشادات کی رُو سے جماعت بندی، فرقہ بندی سنگین جرم قرار پاتا ہے کیونکہ اللہ نے اصلاح و تبلیغ کے عملی نمونے بھی قرآن میں بیان کر دیا ہے، ملاحظہ ہو:

۱) يٰٓاَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ۭ وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ ۭ وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ ۶۷ (المائدہ) ''اے رسولؐ جو کچھ تم پر تمہارے رب کی طرف سے نازل کیا گیا ہے اُسے (لوگوں تک) پہنچا دو، اور اگر ایسا نہ کیا تو آپؐ نے اُس کا پیغام نہیں پہنچایا (پیغمبر ہونے کا حق ادا نہیں کیا)، اور اللہ آپ کو انسانوں (کے شر) سے بچائے گا، یقین رکھو اللہ کافروں کو راہ نہ دکھائے گا''

ڈاکٹر ولاء جمال العسیلی۔ایسوسی ایٹ پروفیسر شعبۂ اُردو عین شمس یونیورسٹی قاہرہ۔مصر

سرسید احمد خان اپنے اخلاقی اور اصلاحی مضامین کی روشنی میں

علم معاشرت یا علم تمدن (Sociology) کے ماہرین کہتے ہیں کہ انسان اپنے ماحول اور معاشرے کی پیداوار ہے اور بلاشبہ سرسید احمد خان بالکل ایسے ہی ہیں۔وہ اپنے زمانے کے حالات سے واقف تھے، اپنے معاشرے کے حالات سے متاثر ہوئے - وہ انیسویں صدی میں اسلامی ہندوستان کی تاریخ کی عظیم شخصیات میں سے ایک ہیں، اور اس میں کوئی شک نہیں کہ جو شہرت انہوں نے حاصل کی وہ اس دور میں کسی دوسرے مسلمان کو میسر نہ ہوئی، ان کو ہندوستان کے مسلمانوں کی تاریخ، تہذیب اور سیاست میں فراموش یا نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔قدیم اور جدید اسلامی فکر کی تاریخ میں ان کا مقام ایک بڑا مقام ہے۔

در حقیقت ہندوستان میں کئی صدیوں تک مسلمانوں کی ایک اسلامی ثقافت رہی اور ان کو ایک ہزار سال تک سیاسی اثر ورسوخ حاصل رہا، لیکن یہ مغل ریاست کے خاتمے کے ساتھ ختم ہوا اور 1857ء میں ہندوستان میں آزادی کے انقلاب کی ناکامی کے بعد، مسلمانوں کے حالات بگڑ گئے، ان کی طرز زندگی خراب ہوگئی، وہ اسلام کے پیغام سے منحرف ہوگئے اور ان میں گمراہ کن اور جھوٹے نظریات اور نقصان دہ خیالات در آئے۔مسلمانوں کے بگڑتے ہوئے حالات دیکھ کر سرسید گھبرا گئے اور علاج کے طریقوں اور نجات کی راہوں کے بارے میں سوچنا شروع کیا۔وہ ہندوستان میں مسلمانوں کی تاریخ کے اس مشکل دور میں قیادت کرنے والے اور تحریک چلانے والے پہلے شخص تھے۔

ہندوستان میں وہ سب سے پہلے یورپی معاشرے اور مغربی تہذیب کے علوم اور ادب سے متاثر ہوئے اور مغربی علوم اور فنون کے پھیلاؤ کے لیے سب سے پہلے تعلیم کے میدان میں اپنے کام کے علاوہ اسلامی تشخص کی پاسداری اور اسے محفوظ رکھنے کی ضرورت پر زور دیا۔ انہوں نے اپنی کوششوں کو ایک ہی میدان تک محدود نہیں رکھا بلکہ انگریزی حکومت کے ساتھ بات چیت اور مسلمانوں اور انگریزوں کو قریب لانے اور ان کے درمیان تعلقات قائم کرنے کی کوششوں کے ساتھ ساتھ کئی سیاسی کارروائیاں بھی کیں تاکہ انگریز مسلمانوں پر ظلم وستم کا خاتمہ کریں اور مسلمان مغرب کے علوم وفنون سیکھنا شروع کردیں۔ دوسری طرف، سماجی میدان میں بھی ان کی کوششیں اور جدوجہد تھیں۔وہ ہندوستان میں معاشرے کے تمام پہلوؤں میں اصلاح اور تبدیلی کا مطالبہ کرنے والے اوّلین لوگوں میں تھے، وہ فرسودہ رسم و رواج کو چھوڑنے توہمات سے دور رہنے، ترقی کے لیے تعلیم پر توجہ دینے کے ساتھ ساتھ یورپی اور جدید تہذیب سے فائدہ اٹھانے کی ترغیب دے رہے تھے۔ وہ اپنے مضمون (وحشیانہ نیکی) میں کہتے ہیں:

''شائستہ ملک کی مثال صورت بنانے والے سنگ تراش کے کارخانے کی سی ہے۔۔ نا مہذب ملک کی مثال منڈے پہاڑوں کی سی ہے''۔

ایک اور مضمون میں بھی کہتے ہیں:

''دیکھو ہندوستانیوں نے اپنی غفلت سے اپنا علم بھی ضائع کر دیا اور اپنی قومی عزت کو بالکل برباد کر دیا۔''

سرسید احمد خان نے مسلمانوں کی ناگفتہ بہ صورت حال سے واقف ہونے کے بعد قوم کی اصلاح کے لیے شاعری اور ادب میں اصلاح کی ضرورت محسوس کی کیونکہ یہ واحد موثر ذریعہ تھا جس کے ذریعے ان کے خیالات لوگوں تک پہنچائے جاسکتے تھے، اس وقت کے ادباء اور شعراء صرف محبت اور محبت کرنے والوں کی داستانیں لکھا کرتے تھے، اور مسلمانوں کی زندگی پر اس کے پڑنے والے منفی اثرات کے بعد یہ کہانیاں سود مند نہیں رہیں اور با مقصد اصلاح پسند ادب کا ہونا ضروری تھا۔

وہ 1869 عیسوی میں انگلینڈ کے سفر سے واپس آئے یہ ان کی زندگی کا سب سے اہم سال تھا، اس میں انہوں نے مغرب کی تہذیب، اور ان کی زبردست ترقی دیکھی لہٰذا انہوں نے ان کا موازنہ اپنے موجودہ ہندوستانی معاشرے سے کرنا شروع کیا۔ سرسید نے سماجی اور اخلاقی اصلاحات اور سائنسی ترقی کے لیے کئی منصوبے بنائے۔ انہوں نے رسالہ تہذیب الاخلاق جاری کیا، جو ملک بھر میں پھیل گیا، یہ ایسے موضوعات شائع کرتا جن کا معاشرے کے ہر فرد سے تعلق ہوتا، اور روز مرہ کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کرتا۔ اس رسالے کا مقصد ہندوستان کے مسلمانوں کو متمدن بنانے کی ترغیب دینا، اور ایسے مغربی علوم پر توجہ دینا تھا جو ان کے سماجی اور تہذیبی معاملات میں اصلاحات لاسکیں، یہ رسالہ مذہبی نظریات کی ترقی اور توسیع کے لئے بھی کوشاں تھا۔ سرسید ہندوستان کے مسلمانوں کو مایوسی سے نکالنا چاہتے تھے، ان کو جدید علوم سیکھانا چاہتے تھے، اور مذہب کو عقلی شواہد اور ثبوتوں سے سمجھنا چاہتے تھے۔ سرسید نے مذہب، ادب، سیاست، رسم و رواج، تاریخ، فلسفہ اور فکر و علم کے دیگر پہلوؤں پر بہت سے مضامین لکھے۔ بلا شبہ سرسید احمد خان اردو ادب میں مضمون نگاری کے فن کے بانی ہیں۔ سرسید احمد خان کے اخلاقی اور اصلاحی مضامین سرسید کے سولہ مضامین کے پانچویں حصے میں شائع ہوئے تھے اور میرے خیال میں یہ پانچواں حصہ بہت اہمیت کا حامل ہے، یہ حصہ عام طور پر ہندوستان کی تاریخ میں اور خاص طور پر دنیا کے مسلمانوں کیلئے اہم اخلاقی اور اصلاحی موضوعات پر مشتمل ہے۔ انہوں نے اپنے اخلاقی مضامین میں مسلمانوں میں عام اخلاقی نقائص کو ختم کرنے کی کوشش کی، جس کی وجہ سے وہ اپنی عزت اور وقار کھو بیٹھے تھے اور انہوں نے مسلمانوں سے ان اچھے اخلاق کے اظہار کا مطالبہ کیا جن کا مطالبہ خود اسلام نے کیا تھا اور چونکہ انگریزوں کی حکومت کے دوران مغربی اخلاقیات اور مغربی تہذیب نے ہندوستان پر ایک زبردست طاقت کے ساتھ غلبہ پایا تھا، انگریزی تعلیمی نظام ہندوستانیوں کو غلام بنا رہا تھا، ان میں احساس کمتری پیدا کر رہا تھا، اسلامی اخلاق اور مذہبی جذبات مر رہے تھے۔ اس لئے سرسید احمد خان نے اپنے مضامین میں اخلاقیات پر زور دیا، کیونکہ وہ ایک مصلح تھے جو اپنی قوم کے افراد کے لیے نفسیاتی خوشی اور ذہنی سکون حاصل کرنا چاہتے تھے، اور ان کے لیے ایک محفوظ اور

مطمئن زندگی بنانا چاہتے تھے۔

انہوں نے اپنے اخلاقی اور اصلاحی مضامین کے ضمن میں جو مضامین پیش کئے وہ ہندوستانی معاشرے سے تعلق رکھتے ہیں اور اس سے براہ راست وابستہ ہیں، چنانچہ آزادی، مساوات، رواداری، یکجہتی، اندھی تقلید، اخلاقیات، فرسودہ رسم و رواج اور ان پر عمل کرنے کے نقصانات، دنیا سے مذہب کا رشتہ، خودغرضی، بات چیت میں اختلاف کے آداب، دوسری رائے کا احترام۔ قومی اتحاد، حب الوطنی، طرز زندگی، کھانے پینے کا طریقہ، دوسرے مذاہب کے لوگوں کے ساتھ شائستہ سلوک، نفاق، ہندوستان میں خواتین کے حالات کی اصلاح اور خواتین کی تعلیم جیسے موضوعات ان میں شامل ہیں۔ سرسید نے معاشرے میں خواتین کو نظرانداز نہیں کیا، مختلف موضوعات پر خواتین کی اصلاح پر کئی مضامین لکھے، جن میں بعض یہ ہیں: خواتین کے ساتھ ہندوستانی معاشرہ کی ناانصافی، بیوہ کی شادی کو قبول نہ کرنا، عورتوں کی تعلیم سے بے توجہی، کم عمری میں لڑکی کی شادی کرنے کا رواج، یا بوڑھے آدمی سے اس کی شادی کروانا اور اسے میراث کا حق نہ دینا۔ یہ تمام موضوعات بہت اہمیت کے حامل ہیں۔

آ کے دیکھیں سرسید نے اپنے مضمون (قومی اتحاد) میں عقیدے اور خیالات کی آزادی کے بارے میں بات کی، وہ بھی لوگوں کو دوسرے کی رائے اور عقیدے کا احترام کرنے پر زور دیا:

''ہم کو کسی شخص سے اس خیال پر کہ وہ شیعہ ہے یا سنی، وہابی ہے یا بدعتی، لامذہب ہے یا مقلد یا نیچری یا اس سے کسی بدتر لقب کے ساتھ ملقب ہے، جبکہ وہ خدا و خدا کے رسول کو برحق جانتا ہے، کسی قسم کی عداوت و مخالفت رکھنی نہیں چاہیے، بلکہ اس کو بھی بھائی اور کلمے کا شریک سمجھنا اور اس اخوت کو جس کو خدا نے قائم کیا ہے، قائم رکھنا چاہئے''۔

ایک اور مضمون میں، جو انسان اپنے رواج اور روایات کو بغیر سمجھے دوسروں کی نقل کرتا ہے، اسے بندر سے تشبیہ دی جاتی ہے۔ سرسید کہتے ہیں:

''اخلاقی اور عقلی قوتوں کی ترقی اس صورت میں حاصل ہوتی ہے جبکہ وہ استعمال میں لائی جاویں۔ ان قوتوں کو اوروں کی تقلید کرنے سے کسی بات کی مشق حاصل نہیں ہوتی بلکہ ایسے شخص کیلئے بجز ایسی قوت تقلید کے جو بندر میں ہوتی ہے اور کسی قوت کی حاجت نہیں۔''

ان مضامین کے ذریعے سرسید نے پسماندگی اور منحرف قوتوں سے لڑنے اور اپنے لوگوں کو برے رسم و رواج سے آزاد کرنے کے لیے کام کیا۔ اندھے تعصب، نفاق اور جھوٹ اور دیگر بری عادات کو چھوڑ کر اور اپنے طرز زندگی کو تبدیل کر کے ترقی اور تہذیب کے راستے پر چلنے کا بھی مشورہ دیا۔

''انسان کی بدترین خصلتوں میں سے تعصب بھی ایک بدترین خصلت ہے یہ ایسی بدخصلت ہے کہ انسان کی تمام نیکیوں اور اس کی تمام خوبیوں کو غارت اور برباد کرتی ہے۔ متعصب گو اپنی زبان سے نہ کہے مگر اس کا طریقہ یہ بات جتلاتا ہے کہ عدل و انصاف کی خصلت جو عمدہ ترین خصائل انسانی ہے اس میں نہیں ہے۔ متعصب اگر کسی غلطی میں پڑتا ہے تو اپنے تعصب کے سبب اس غلطی سے نکل نہیں سکتا کیونکہ اس کا تعصب اس کے برخلاف بات کے سننے اور سمجھنے اور اس پر غور کرنے کی اجازت نہیں

دیتا اور اگر وہ کسی غلطی میں نہیں ہے بلکہ سچی اور سیدھی راہ پر ہے تو اس کے فائدے اور اسکی نیکی کو پھیلنے اور عام ہونے نہیں دیتا کیونکہ اس کے مخالفوں کو اپنی غلطی پر متنبہ ہونے کا موقع نہیں ملتا۔ تعصب انسان کو ہزار طرح کی نیکیوں کے حاصل کرنے سے باز رکھتا ہے اکثر دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ انسان کسی کام کو نہایت عمدہ اور مفید سمجھتا ہے مگر صرف تعصب سے اس کو اختیار نہیں کرتا اور دیدہ ودانستہ برائی میں گرفتار اور بھلائی سے بے زار رہتا ہے۔"

بلاشبہ سرسید کے مضامین نے اپنا کردار بخوبی انجام دیا اور سرسید کے مقاصد کو بڑی حد تک پورا کیا، چنانچہ ہندوستانی مسلمانوں کے طرز زندگی اور سوچ میں تبدیلی آئی اور ان تبدیلیوں کی وجہ سے ان کی زندگیوں میں شائستہ ترقی آئی، ان مضامین نے مسلمانوں میں عدم برداشت کی شدت کو کم کرنے اور بری عادات وروایات، کاہلی اور غلط نظریات پر قائم رہنے جیسی ان منفی چیزوں کو چھوڑنے میں مدد کی جو ان کی کمزوری اور بگاڑ کا سبب بنیں، اسی طرح قومی اور سیاسی احساس بیدار کرنے، مسلمانوں میں قوم پرستی کے جذبات پیدا کرنے اور افراد میں تعاون کے حوصلے عام کرنے میں بھی حصہ لیا۔

سرسید کے مضامین کی کئی نمایاں لسانیاتی اور اسلوبیاتی خصوصیات ہیں، مثلاً انہوں نے بیشتر اخلاقی اور اصلاحی مضامین میں خطابت کا انداز اختیار کیا اور اس کے ذریعے مسلمانوں کو مشورے دیئے اور ان کی رہنمائی کی، سرسید نے مختصر جملے اور پیراگراف بھی استعمال کیے تاکہ مضمون پڑھنا قاری پر بوجھ نہ بن جائے، اس کے علاوہ قرآنی آیات، عربی امثال، نبوی احادیث، محاورے، فارسی اشعار اور اردو مکالمے بھی استعمال کئے۔

ان کے ایک مضمون سے ایک نمونہ ہے:

"غرض کہ کسی شخص کے دل کو بے کار پڑا رہنا نہیں چاہئے کسی نہ کسی بات کی فکر وکوشش میں مصروف رہنا لازم ہے تاکہ ہم کو اپنی تمام ضروریات کے انجام کرنے کی فکر اور مستعدی رہے اور جب تک کہ ہماری قوم سے کاہلی یعنی دل کو بے کار پڑا رکھنا نہ چھوٹے گا اس وقت تک اپنی قوم کی بہتری کی توقع کچھ نہیں ہے۔ نہایت حکیمانہ قول ہے کہ:

بے کار مباش کچھ کیا کر
گر کر نہ سکے تو کچھ کہا کر"

سرسید احمد خان اپنے مضامین میں کسی بھی موضوع کی تائید میں ثبوت بھی فراہم کیا کرتے تھے، اور ان کے مضامین میں مہذب طنز ومزاح بھی موجود ہے، انہوں نے کسی مخصوص طبقے کے لیے نہیں لکھا بلکہ اپنی قوم کے ان تمام افراد کے لیے لکھا جن کی وہ اصلاح کرنا چاہتے تھے۔ انہوں نے عام لوگوں کے قریب ہونے کے لیے پر تکلف انداز سے گریز کیا، وہ صرف یہ چاہتے تھے کہ ان کے دل میں جو کچھ ہے اسے اپنے مضامین کے ذریعے دوسروں کے دلوں میں اتار دیں۔ اس لئے انہوں نے سادہ انداز استعمال کیا تاکہ قاری ان کو باآسانی سمجھ سکیں۔

سرسید کا نقطہ نظر یہ تھا کہ اسلوب ہموار ہوں، خیال میں گہرائی ہو، اور بات لوگوں تک واضح شکل میں پہنچائی جائے، اسی لئے وہ قاری کے ذہن کو سمجھنے اور اس کی سوچ کو توڑنے اور ترسیل کے عمل کو حاصل کرنے میں کامیاب رہے، اور یہی ہر اچھے مضمون کا بنیادی مقصد ہوتا ہے۔ ان کی مذہبی پرورش اور ان کی اسلامی ثقافت کی وجہ

سے اسلامی مذہبی رجحان ان کے مضامین میں واضح تھا اور ان کے اس عقیدے کی وجہ سے کہ اسلام اور اس کی تعلیمات کی طرف لوٹنا سنجیدہ اصلاح کا مثالی ذریعہ ہے، چنانچہ ان کا خیال تھا کہ دینی اصلاح دنیوی اصلاح کی بنیاد ہے۔

اپنے مضمون ''ہمیں دوسرے مذاہب کے ماننے والوں کا احترام کرنا چاہیے'' میں وہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اس بات کا حکم قرآن کریم میں دیا ہے کہ دوسرے مذاہب کے لوگوں کے ساتھ اچھا سلوک کرنا ہے۔

''ہم کو نہایت افسوس ہے کہ جب ہم مذہبی پیشواؤں کی کوئی کتاب دیکھتے ہیں تو اس میں ایک مذہب والا دوسرے مذہب کے پیشواؤں کا بری طرح ذکر کرتا ہے، یہ امر مذہب اسلام کے بالکل برخلاف ہے جس مذہب کے جو پیشوا ہیں جب ہم اپنے مذہبی مباحثوں میں ان کا ذکر کریں خواہ وہ لوگ ہندو ہوں یا پارسی عیسائی ہوں یا یہودی یا خود مختلف عقائد کے مسلمان ہی ہوں اگر ہم ان کے بزرگوں و پیشواؤں کے ساتھ گستاخی سے پیش آئیں گے تو کیا وجہ ہے کہ وہ اس طرح ہمارے بزرگوں اور پیشواؤں کے ساتھ گستاخی اور بے ادبی سے پیش نہ آئیں۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے ہم کو حکم دیا ہے کہ ''ولا تسبو الذین یدعون من دون اللہ فیسبوا اللہ عدوا بغیر علم'' سورۃ الانعام آیت 108

سرسید نے زندگی اور معاشرے کے تمام معاملات سے متعلق بامقصد ادب شائع کیا، ان کی تحریروں میں عقل اور حقیقت پسندی نے جذبات اور تخیل کی جگہ لی۔ ان کی ان ہی خوبیوں اور خصوصیات کی وجہ سے ان کے کئی ہم عصر ادیب ان سے متاثر ہوئے اور سرسید کے مضامین کا اثر ان کے مضامین اور خیالات پر ظاہر اور عیاں ہے۔ ان میں سے کچھ ادیبوں نے سرسید کے اصلاحی خیالات سے اتفاق کیا اور سرسید کے نظریات کا مختلف طریقوں سے جائزہ لیا، ایسے ادیبوں میں الطاف حسین حالی، نذیر احمد دہلوی، محسن الملک، ذکاء اللہ اور شبلی سرفہرست ہیں اور ان میں سے کچھ نے سرسید کی تقلید کی اور ان کے نقش قدم پر چلے۔ ان میں چراغ علی اور وحید الدین سلیم قابل ذکر ہیں۔ خلاصہ یہ کہ سرسید کے بعد آنے والے ادیب کسی نہ کسی شکل میں ان سے ان کی تحریروں سے اور ان کے نظریات و خیالات سے ضرور متاثر ہوئے۔

آخر میں کہہ سکتی ہوں کہ کسی بھی معاشرے میں اصلاح اور تبدیلی کا عمل کوئی آسان کام نہیں جو راتوں رات ہو جائے، بلکہ یہ ایک مشکل عمل ہے، خصوصاً ایسی صورت میں یہ کام انتہائی مشکل ہو جاتا ہے جب کچھ سخت گیر قسم کے لوگ ان کی مخالفت بھی کر رہے ہوں۔ جیسا کہ سرسید احمد کے ساتھ ہوا۔ سرسید کے بہت سے دشمن ان کے نئے نظریات سے لڑتے نظر آئے اور ان کی دشمنی اس حد تک پہنچ گئی کہ انہوں نے ان پر کفر (بے دینی) کا فتویٰ بھی لگا دیا۔ لیکن سرسید ان سے متاثر نہیں ہوئے۔ انہوں نے اپنا اصلاحی کام جاری رکھا، اور نتیجہ یہ ہوا کہ لوگ ان کے اردگرد جمع ہوئے، اور ان کی مخالفت کرنے والوں کی کوئی پرواہ نہیں کی، اور اپنے خیالات کو ظاہر کرنے میں ہمت اور دلیری سے کام لیا۔ وہ اپنے مضمون (مخالفت) میں کہتے ہیں:

''دشمنی اور عداوت، حسد اور رنجش اور ناراضگی کے سوا ایک اور جذبہ انسان میں ہے جو خود اسی شخص میں

کمینی عادتیں اور رزیل اخلاق پیدا کرتا ہے اور باوجود اس کے کہ وہ اپنے مخالف کو کچھ نقصان پہنچاوے خود اپنا نقصان کرتا ہے۔ اس انسانی جذبے کو ہم مخالفت کہتے ہیں۔ ہم کو بڑا افسوس ہے کہ ہمارے مخالف اس پچھلے طریقے پر ہم سے مخالفت کرتے ہیں۔ ہم اپنی مخالفت میں رسواء و بدنام ہوتے ہیں اور دنیا انہی کو دروغ گو و کذاب قرار دیتی ہے۔ اگر ان کو ہمارے حال پر رحم ہے تو خود ان کو اپنے حال پر رحم کرنا چاہئے۔ **ربنا تقبل منا انک انت السمیع العلیم.** جس طرح سید احمد خان نے اپنے مضامین میں اچھے خیالات اور اعلیٰ اخلاق پیش کیے، ان میں اسلامی روایات اجاگر کیے، اپنے معاشرے کی خطرناک صورت حال کو محسوس کیا اور مسلمانوں کی ایک اچھی اور نئی زندگی کے لیے تڑپتے رہے۔ اسی طرح آج ہمیں بھی محبت کی کہانیوں سے زیادہ با مقصد ادب کی ضرورت ہے، زندگی کے تمام شعبوں میں اصلاحات ہونی چاہئیں، مساوات اور انصاف پر توجہ دینی چاہیے اور انسانی جذبات اور احساسات کو گندگیوں سے پاک کرنا چاہئے۔ خیال رہے کہ اخلاقی اصول، افراد اور معاشروں کی عمدہ زندگی کا ایسا نمونہ فراہم کرتے ہیں جو ترقی اور خوشحالی کو اخلاق کی بنیادوں اور سچائی کے ستونوں پر قائم کرتا ہے، اور تمام توحید پرست مذاہب کی طرف سے لائی گئی اقدار کی رہنمائی کرتا ہے۔ چنانچہ جس دن افراد اور جماعتوں کے دلوں میں یہ روحانی اقدار اور انسانی معنی پیوست ہو جائیں گے اسی دن موجودہ عالمی مسائل کا حل آسان ہو جائے گا۔ اور ایسا بین الاقوامی تنازعہ ختم ہو جائے گا جو کمزوروں کی طاقتوں کے استحصال کے لئے کوشاں ہے۔

شاہ نواز ہاشمی۔ حیدرآباد

سالِ نو

سالِ نو محبت کی بات بتانے آیا
ہم کو جینے کا سلیقہ یہ سکھانے آیا

خیر امت ہو تمہیں اور ہمیں ہو ہادی
بس اسی بات کا احساس دلانے آیا

سالِ نو آیا ہے غم اس کا مناؤں کے خوشی
کیونکہ یہ عمر کا اک سال گھٹانے آیا

میں نے مانا کے نیا سال ملا ہے مجھ کو
پھر بھی لگتا ہے ہمیں ہوش میں لانے آیا

زندگی گھلتی ہے اک برف کی مانند یہاں
ہر نیا سال یہی بات بتانے آیا

ہاشمی کوئی یہاں تیرا ٹھکانہ تو نہیں
جو بھی آیا ہے یہاں لوٹ کے جانے آیا

ہاشمی تم بھی ندامت کے بہاو آنسو
یہ نیا سال گناہوں کو مٹانے آیا

ڈاکٹر محمد انور (این ٹی ایم، سی آئی ایل، میسور)

ادا جعفری کی شعری کائنات کا فکری وفنی مطالعہ

عزیز جہاں ۲۲/ اگست ۱۹۲۴ء کو بدایوں میں پیدا ہوئیں ۔انھیں بچپن سے ہی شعر وشاعری سے شغف تھا۔ رفتہ رفتہ یہ ذوق پروان چڑھا اور خود شعر تخلیق کرنے لگیں۔ اوّلاً وہ ادا بدایونی کے نام سے ادبی حلقے میں روشناس ہوئیں تاہم بعد میں ادا جعفری کے نام سے مشہور ہوئیں۔ شعری اصلاح انہوں نے اثر لکھنوی اور اختر شیرانی سے لی۔ ان کی شاعری کی ابتدا نظم گوئی سے ہوئی۔ ۱۹۴۵ء میں ان کی پہلی غزل ''رومان'' میں شائع ہوئی۔ جو اس وقت بڑا ادبی جریدہ تھا۔ اس ابتداء کے بعد تواتر کے ساتھ ادا چھپتی رہیں اور اردو کے تمام تر معیاری رسالے ان کی تخلیقات سے مزین ہوئے۔ ۱۹۴۷ء میں وہ نورالحسن جعفری کے ساتھ رشتہ ازدواج میں منسلک ہوئیں۔

ادا جعفری نے نظموں اور غزلوں کے علاوہ ہائیکو بھی لکھے اور ہائیکو کا ایک الگ مجموعہ بھی شائع کیا۔ ۱۹۶۸ء میں ان کے مجموعۂ کلام 'شہہ درد' پر پاکستان حکومت نے انہیں 'آدم جی' اور 'تمغۂ امتیاز' سے نوازا۔ ادا جعفری کے مندرجہ ذیل مجموعے بشمول خودنوست منظر عام پر آچکے ہیں۔

میں ساز ڈھونڈتی رہی، شہہ درد، غزالاں تم واقف ہو، ساز سخن بہانہ ہے، حرف شناسائی، غزل نما، جو رہی سو بے خبری رہی (خودنوشت)۔ ان مجموعوں نے ادا جعفری کی پہچان بنائی اور اردو ادب میں ان کے قد کو اونچا کیا۔ ادا نے جس وقت اپنا شعری سفر شروع کیا اس وقت اردو ادبی منظرنامے پر فراق، فیض، اختر الایمان اور احمد ندیم قاسمی کا شہرہ تھا۔ دوسری طرف مجید امجد، مجروح، ساغر، عدم، مجاز، ساحر اور سردار جعفری نمایاں تھے۔ تاہم شعر وسخن کے اس توانا عہد میں ادا نے اہل ذوق کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ ان کی شاعری سے متعلق معاذ حسن نے لکھا ہے کہ:

> ''ادا جعفری موجودہ دور کی وہ شاعرہ ہیں جن کا شمار بہ اعتبار طویل مشق سخن اور ریاضت فن کے صف اول کی معتبر شاعرات میں ہوتا ہے۔ وہ کم وبیش پچاس سال سے شعر کہہ رہی ہیں۔ گاہے گاہے یا بطرز تفریح طبع نہیں بلکہ تواتر وکمال احتیاط کے ساتھ کہہ رہی ہیں اور جو کچھ کہہ رہی ہیں حرف و صوت کی شگفتگی اور فکر وخیال کی تازگی کے ساتھ کہہ رہی ہیں۔ فکر وجذبے کے ارتعاش کے ساتھ کہہ رہی ہیں جس کی بدولت آج سے تیس چالیس سال پہلے ان کا شعر پہچان لیا جاتا تھا''۔(۱)

اس تناظر میں سب سے پہلے ہم ان کی شاعری پر ایک نگاہ ڈالتے ہیں یہاں ان کی غزلوں نظموں اور ہائیکو سے چند نمونے پیش ہیں جن سے کے رنگ سخن کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔

جب دل کی رہگذر پہ ترا نقش پا نہ تھا
جینے کی آرزو تھی مگر حوصلہ نہ تھا
کچھ لوگ شرمسار، خدا جانے کیوں ہوئے
ان سے تو روح عصر، ہمیں کچھ گلہ نہ تھا

☆

کیا جانے کس بات پر مغرور رہی ہوں
کہنے کو تو جس راہ چلایا ہے چلی ہوں
تم پاس نہیں ہو تو عجب حال ہے دل کا
یوں جیسے میں کچھ رکھ کے کہیں بھول گئی ہوں

☆

شاید ابھی ہے راکھ میں کوئی شرار بھی
کیوں ورنہ انتظار بھی ہے، اضطرار بھی

☆

کچھ بت بنا لئے ہیں چٹانیں تراش کر
دل بھی بہانہ ساز ہے، غم بھی بہانہ ساز

☆

بے حس نہیں کہ سنگ سر راہ جانئے
ساکت ہیں اہل ظرف غم آگہی لئے

☆

سلگ اٹھی تو اندھیروں کا رکھ لیا ہے بھرم
جو روشنی ہوں تو کیوں چشم نوحہ گر میں رہوں

ادا کے یہ اشعار اس بات کی دلیل ہیں کہ وہ اپنے اشعار کو فلسفے کی پر پیچ وادیوں اور نفسیات کی مبہم اور دھندلی پرچھائیوں سے بچانے کا ہنر جانتی ہیں۔ ان کے کلام کی سلاست وسادگی ہی دراصل ان کی پہچان ہے۔

نظموں میں بھی ادا کا رنگ وآہنگ یہی ہے۔ یہ الگ بات کہ کہیں کہیں پر جذبے کی آنچ زیادہ تیز ہوگئی ہے لیکن ادا کا اعتماد، جہد مسلسل، ان کا عزم ان کی نظموں کو خوبصورت بناتا ہے اور اچھی شاعری کی مثال بھی پیش کرتا ہے۔ مثلاً

غم رسیدہ نہ ہو، آبدیدہ نہ ہو
قافلہ تو ہمیشہ رہا تیز رو
ایک مشعل بجھی دوسری جل گئی
ایک مرجھا گئی اک کلی کھل اٹھی
وہ جو انسان ہیں
اک کلی کے لئے اک کرن کے لئے
جاں لٹاتے رہے سر کٹاتے رہے
سچ کہو دوستو، سچ کہو ساتھیو
تم نے انساں کو بھی مرتے دیکھا کبھی
اس کے دامن کو دستِ اجل چھو سکا؟

(میراث آدم)

اپنی تخلیق پہ نازاں ہوں کہ شرمندہ ہوں
آگے کچھ دیکھنا چاہوں تو وہم آتا ہے
اور سرگوشیاں کرتا ہے یہ ممتا کا جنوں
کٹ ہی جائے گا شبِ تار کا اک اور فسوں
دیکھ نادان ہے نادان سے مایوس نہ ہو
آخر انسان ہے انسان سے مایوس نہ ہو

(ماں)

جب بہار آئے گی
جانے میں کہاں ہوں گی
تم تو بھول جاؤ گے
لمس میرے ہاتھوں کا
خواب میری آنکھوں کے
میں تمہیں نہ بھولونگی
میں کہ فطرتاً ماں ہوں

(میلادِ بہار)

آداجعفری کے شعری موضوعات اس بات کا اعلانیہ ہیں کہ انہوں نے محض تفنن طبع کے لیے شاعری نہیں کہ بلکہ ان کی شاعری میں وہ نیک نیتی شامل ہے جو ترقی پسند شاعری کا امتیاز رہی ہے۔ آداجعفری کے تعلق سے اخیر میں نجمہ رحمانی کے حوالے سے فیض احمد فیض کی رائے کو نقل کرنا اس لیے ضروری ہے کہ یہ معلوم ہو سکے کہ فیض احمد فیض نے بھی آداجعفری کی شاعری کا استقبال کیا۔ نجمہ رحمانی نے اپنی کتاب ''آزادی کے بعد اردو شاعرات'' میں اسے نقل کیا ہے۔ ان کے بموجب:

''شہر درد کے نام سے جب ان کا دوسرا مجموعہ سامنے آیا تو اس کا کینوس ''میں ساز ڈھونڈتی رہی'' کی بہ نسبت زیادہ وسیع تھا۔ فکر و خیال کے دھندلکے ''شہر درد'' میں چھٹتے نظر آتے ہیں اور ان سے امید و یقین کی نئی شعاعیں نکلتی ہیں وہ اضطرابی کیفیت جو ان کے پہلے مجموعے میں دکھائی دیتی ہے یہاں ایک پرسکون پر یقین مستحکم نصب العین میں بدل گئی ہے۔ اب وہ زندگی کو خانوں میں بانٹ کر نہیں دیکھتیں بلکہ ذات و کائنات کے امتزاج سے اپنے فن کا رشتہ استوار کرتی ہیں۔ تواتر اور تسلسل کا یہ جمود ٹوٹتا ہے تو سامنے ایک روشن راستے کو اپنا منتظر پاتی ہیں''۔ ۹

نجمہ رحمانی اپنی گفتگو کو معتبر اور موثر بنانے کے لیے فیض احمد فیض کی مندرجہ ذیل عبارت کا سہارا بھی لیتی ہیں:

''آدا بدایونی جو ساز ڈھونڈ رہی تھیں غالباً اب آدا جعفری کو 'شہر درد' میں ہاتھ آ گیا، آدا کے لہجے میں اب ایسا یقین اور ان کی آواز میں ایسی تمکنت ہے جو شاعر کو جہد اظہار میں اپنا مقام ہاتھ آنے کے بعد ہی نصیب ہوتی ہے۔ ''شہر درد'' نہایت موثر باسلیقہ اور باوقار مجموعہ ہے''۔ (۲)

اب وہ صرف ماضی اور حال کے بارے میں نہیں سوچتیں بلکہ ان کی آنکھوں میں ایک خوش آئند مستقبل کے خواب بھی جگمگا رہے ہیں۔ کائنات کے رموز سے آشنائی زندگی اور فن سے ان کی شناسائی تقریباً تمام غزلیات و نظموں میں جھلکتی ہے۔ اب ان کے یہاں لہو رنگ آنسو اور اداسی کا دشت نہیں بلکہ حوصلہ اور عزم و استقلال موجود ہے''۔ (۳)

بہر حال اس مطالعہ سے یہ اندازہ بخوبی ہو جاتا ہے کہ اردو ادب کے جملہ شعبہ بطور خاص اردو شاعری میں خواتین نے گہرے نقوش قائم کئے ہیں۔ سب سے دلچسپ بات یہ ہے کہ وہ تاثر جو صرف خواتین کا حصّہ ہی تھا اور جس سے اردو شعر و ادب ابتک محروم تھا اس کی افادیت کھل کر سامنے آئی ہے اور ان احساسات و جذبات نے شاعری میں عمومیت کے ساتھ ایک غالب رجحان کی صورت اختیار کرنا شروع کر دیا ہے، اس میں روز افزوں ترقی ہو رہی ہے اور نئے امکان کے دروازے کھلتے جا رہے ہیں۔ نیز ان کے مسائل اور افکار سے بھی اردو دنیا روشناس ہو رہی ہے۔ خواتین اہلِ قلم کی موجودہ پیش رفت سے ادبی شعبہ میں خوشگوار پہلوؤں کی شمولیت کا امکان ہے۔

حواشی

۱۔ معاذ حسن، اُردو کی ٹاپ ۱۰ شاعرات، ص: ۱۸

۲۔ نجمہ رحمانی، انتخابِ سخن، ص: ۸

۳۔ ایضاً

قمر صدیقی۔ممبئی

غزل

بالکل سچے سونے جیسا یارو کھرا نہیں ہوں میں
لیکن جتنا سمجھ رہے ہو اتنا بُرا نہیں ہوں میں

دھرتی، امبر، صحرا، دریا، چاند، ستارے، دشت، پہاڑ
جیت کے سارے جگ کو جانا یارو خدا نہیں ہوں میں

جشن بپا تھا بزم ہوس میں ، نیرنگی تھی رقص کناں
روکنا راہ میں چاہا سب نے پھر بھی رکا نہیں ہوں میں

خواب میں اپنی آنکھ کھلی ہے یا ہے جو یہ خواب ہی ہے
جاگ چکا ہوں یا پھر شاید جاگا ہوا نہیں ہوں میں

گم ہیں خود آشوبِ نوا میں ، میں کیا میرا گریہ کیا
جو گنبد سے پلٹ ہی آئے ایسی صدا نہیں ہوں میں

یارب کب تک دنیا داری سر پہ رہے گی میرے سوار
کب تیری رحمت کی خاطر محوِ دعا نہیں ہوں میں

کروں گا اک دن دور قمؔر میں اس دنیا کی ظلمت کو
ابھی تو من میں آگ لگی ہے پورا جلا نہیں ہوں میں

سید نوید جعفری۔حیدرآباد

غزل

اشک ہر وقت میرا ساتھ نبھانے نکلے
جب خوشی آئی تو خوشیوں کے بہانے نکلے
جس نے نسلوں کی سیاہی کو اجالا بخشا
چند شب زاد وہ سورج کو بجھانے نکلے
جستجو نے تیری عرفان دو عالم بخشا
ہم جسے ڈھونڈنے نکلے وہ سرہانے نکلے
شام سے ڈوبنے لگتا ہے جو دل تو ہم بھی
اپنے پیمانے سے خورشید اگانے نکلے
تیری الفت تیری حسرت تیری فرقت کا ماعال
دل کھنڈر جب ہوا پوشیدہ خزانے نکلے
جن کو فرقت میں کبھی دیکھنے رکھ چھوڑا تھا
ان کے دروازوں میں وہی خواب پرانے نکلے
شہر میں دشت میں گلشن میں تجھی کو پایا
اے غم یار تیرے کتنے ٹھکانے نکلے
چاند نکلا تو میں لوگوں سے لپٹ کر رویا
غم کے آنسو تھے جو خوشیوں کے بہانے نکلے
رزق میں جن کے نہ محنت کا نہ برکت کا خمیر
رزق آشوب کئی ایسے گھرانے نکلے
یاد کس کی ہوئی ہے پاؤں کی زنجیر نویؔد
قرض جاں عشق میں ہم جب بھی چکانے نکلے

محمد خواجہ محی الدین۔ ریسرچ اسکالر جامعہ عثمانی

اردو کے فروغ میں مولانا محمد خواجہ شریفؒ کا حصہ

مولانا محمد خواجہ شریف ولد محمد شہاب الدین کی ولادت ۱۵؍شوال ۱۳۵۹ھ۔ مطابق 4؍جنوری 1940ء قصبہ اگرہارم پوٹلہ پلی رنگاریڈی گوڑہ ضلع شادنگر ریاست تلنگانہ کے ایک معزز وعلمی گھرانے میں ہوئی۔ مولانا کی ابتدائی تعلیم زلفاں والے مولوی صاحب کے پاس اپنے وطن اگرہارم پوٹلہ پلی سے ایک کیلومیٹر دور حضرت سکندر علی درویشؒ کے جوار میں ایک چھوٹے سے غار میں ہوئی۔ پولیس ایکشن کے بعد تقریبا آٹھ برس کی عمر میں والد بزرگوار کے ہمراہ حیدرآباد تشریف لائے، اور گوشہ محل کے مدرسہ تحتانیہ ''رسالہ عبداللہ'' میں داخلہ ہوا، جماعتِ چہارم تک تعلیم حاصل کی، بعد ازاں 1950ء میں مولانا کے برادر کلاں حضرت محمد شریف نے ازہر ہند جامعہ نظامیہ میں جماعت چہارم میں داخلہ کروایا، اس وقت آپ کی عمر دس سال تھی۔ مولانا نے تدریس کا آغاز دارالعلوم مؤتمر العلماء مغل گدہ ضلع محبوب نگر سے کیا، آپ کی صلاحیتوں کو دیکھتے ہوئے 1966ء میں حضرت مولانا مفتی عبدالحمیدؒ سابق شیخ الجامعہ جامعہ نظامیہ نے جامعہ نظامیہ میں شعبہ تدریس میں درخواست دینے کا حکم دیا، مولانا مادر علمی جامعہ نظامیہ کی خدمت کو باعث سعادت سمجھتے ہوئے لبیک کہا اور 150 روپئے ماہانہ مشاہرہ کو خیرآباد کہہ دیا۔ ابتدا میں آپ کا تقرر مہتمم کتب خانہ کی حیثیت سے 75 روپئے مشاہرہ پر ہوا۔ اس موقع پر مولانا عبدالحمیدؒ سابق شیخ الجامعہ جامعہ نظامیہ نے ایک نصیحت آموز جملہ کہا تھا: ''بعض لوگ بڑی تنخواہ کے لیے جامعہ کی ملازمت کو خیرآباد کہہ رہے ہیں اور بعض لوگ جامعہ نظامیہ کے لیے بڑی تنخواہ کو خیرآباد کہہ رہے ہیں''۔ یہ الفاظ ہر اس دینی طالب کے علم لیے نصیحت ہے جو وسائل کے باوجود دینی مدارس وجامعات کو خیرآباد کہہ دیتے ہیں، ان تاریخی الفاظ بھی ایک ایسے وقت میں مولانا عبد الحمیدؒ نے کہے تھے جب ایک استاذ نے سرکاری ملازمت کے لیے جامعہ نظامیہ سے استعفیٰ دیا تھا۔ اس دوران مولانا جامعہ نظامیہ میں مختلف عہدوں پر فائز رہے: (۱) داروغہ (۲) مؤدب (۳) مہتمم کتب خانہ (۴) نائب شیخ الادب (۵) نائب شیخ الحدیث (۶) شیخ الحدیث۔ ان عہدوں پر بحسن وخوبی خدمات انجام دیتے رہے، اسی دوران معتمد مجلس اشاعت العلوم جامعہ نظامیہ اور مدیر مرکز البحوث الاسلامیۃ جامعہ نظامیہ میں بھی زائد خدمات انجام دیئے۔

مولانا محمد خواجہ شریفؒ اردو زبان کے ادیب تھے، دوران طالب علم ہی سے آپ کو تالیف وتصنیف کا شوق تھا، چنانچہ آپ کے اردو تصانیف وتراجم اور تقریبا چالیس (40) مضامین شائع ہوکر منظر عام پر آچکے ہیں، جن میں چند یہ ہیں:

مضامین: حقوق الزوجین، نکاح کا اسلامی تصور، نماز تراویح بیس رکعات، عید میلاد النبی ﷺ، معراج شریف، دینی تعلیم کا مقصد ومنہج، کتب خانہ جامعہ نظامیہ، ختم نبوت حدیث شریف کی روشنی میں، اسلامی تجارت، دہشت گردی

اور اسلام' عورت کی نماز کا طریقہ' علم تفسیر۔ علاوہ ازیں مولانا نے سوانح نگاری میں بھی طبع آزمائی کی۔ تصانیف میں مشہور تصنیف' امام اعظم امام المحدثین ہے۔ مولانا نے کئی کتب کا عربی زبان سے اردو میں ترجمہ کیا، جیسے سیرت امام شافعی قدیم نسخہ۔ زجاجۃ المصابیح 'مؤلفہ، محدث دکن حضرت سید عبداللہ شاہ نقشبندی مجددی قادریؒ کا ترجمہ نور المصابیح ۱۴ جلدوں میں کیا۔ شروحات میں بخاری شریف کی تقریباً ۱۳۰ احادیث شریفہ کی شرح ثروۃ القاری من انوار البخاری کے نام سے کیا۔ اور مشہور ومقبول قصیدہ ''قصیدہ بردہ شریف'' کی مکمل شرح اردو زبان میں لکھی، علاوہ ازیں مولانا دارالعلوم انت پور، اوران کے قائم کردہ تمام اداروں میں ذریعہ تعلیم اردو ہی رہی، البتہ المعہد الدینی العربی کے قیام کے مقاصد میں سے ہے کہ اس کا ذریعہ عربی رہے گا۔ اس کے باوجود اس ادارہ میں بھی روضہ (نرسری) تا عالم (انٹر) گورنمنٹ تلنگانہ کی اردو زبان کی کتاب داخل نصاب ہے، جس میں (700) سے زائد طلبہ وطالبات دینی وعصری علوم سے آراستہ ہورہے ہیں، اسی ادارہ کے تحت ماہ رجب المرجب ۱۴۲۵ھ مطابق ۲۰۰۵ء میں ''مرکز احیاء الادب الاسلامی'' کا قیام عمل میں آیا، جس کی نگرانی بنفس نفیس مولانا محمد خواجہ شریفؒ فرماتے رہے۔ اس کے مقاصد حسب ذیل ہیں: دین کی اشاعت، تحقیق' تصنیف' تالیف' تراجم' مضامین کے ذریعہ۔ اسلامی ذخیرہ کو بین الاقوامی وقومی وعلاقائی زبانوں میں منتقل کرنا۔ عامۃ الناس کو ضروری دینی کتب انتہائی کم قیمت میں فراہم کرنا۔ مرکز سے اب تک مختلف زبانوں میں مختلف موضوعات پر (50) سے زائد کتب شائع ہوکر منظر عام پر آچکی ہیں۔ مرکز نے اردو کے فروغ میں نمایاں کردار ادا کیا چنانچہ کئی کتابیں اردو میں اور کئی عربی کتب کا اردو ترجمہ شائع ہوا۔ مولانا محمد خواجہ شریفؒ ہمیشہ اساتذۂ معہد وطلبۂ معہد اور شاگردوں کو مضامین وکتب لکھنے کی ترغیب دیتے، اسی کا نتیجہ ہے کہ مرکز سے اتنے کم عرصہ میں اتنی کتب زیور طباعت سے آراستہ ہوچکی ہیں۔ فن تجوید کی مقبول ترین کتب میں ''دروس تجوید'' ہے، جو (۲۳) دروس اور (64) پر مشتمل ہے، یہ مولانا حافظ وقاری محمد جواد صدیقی ناظم المعہد الدینی العربی کی تصنیف کردہ ہے۔ زبان عام فہم ہے جو طلبہ کی سہولت کا باعث ہے، ہر تعریف کے تحت مختلف قرآنی مثالیں پیش کی گئی ہیں۔ مدارس' اسکولس اور کالج کے طلبہ وطالبات وعوام الناس کو ذہن میں رکھ کر دروس تجوید کو ترتیب دیا گیا ہے، 2004ء سے اب تک اس کے کئی ہزار نسخے شائع ہوچکے ہیں۔ جس سے اس مرکز اور اس تجوید کی کتاب ''دروس تجوید'' بزبان اردو کی مقبولیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ اسی مرکز سے ایک کیلنڈر ہر سال شائع ہوتا ہے جس پر اردو زبان میں مضامین درج ہوتے ہیں، ہر سال دس ہزار سے زائد کیلنڈر حیدرآباد اور تلنگانہ کے اضلاع اور ہندوستان کی دیگر ریاستوں میں بالکل کم قیمت پر فروخت کئے جاتے ہیں، اس طرح مولانا کا قائم کردہ یہ مرکز احیاء الادب الاسلامی اردو کے فروغ میں مصروف عمل ہے۔

مولانا نے المعہد الدینی العربی شاہ علی بنڈہ حیدرآباد تلنگانہ ریاست میں ایک وسیع وعریض وخوبصورت، تمام تر سہولتوں سے آراستہ لائبریری بنام ''مکتبہ طاہر'' قائم فرمائی جس میں اردو' عربی' انگریزی' فارسی' تلگو ودیگر زبانوں کی درسی وغیر درسی کتب موجود ہیں۔ اساتذہ طلبہ وعوام الناس مطالعہ کے لیے اور ریسرچ اسکالرس تحقیق کے لیے لائبریری کا رخ کرتے

ہیں۔اس لائبریری میں کئی مخطوطے محفوظ ہیں،احقر بھی تحقیق اور مقالہ جات کی تیاری کے لیے اس سے استفادہ کیا۔

اسی طرح مولانا کے دروس وخطابات بزبان اردو ہند وبیرون ہند وقتاً فوقتاً ہوتے رہتے تھے، ہر جمعہ بعد نماز مغرب مسجد چیونٹی شاہ نور خاں بازار حیدرآباد میں درس حدیث وفقہ ہوتا، جس سے بکثرت لوگ مستفید ہوتے۔اور مقدس راتوں میں مسجد چمکورہ خلوت اور مسجد جعفری صنعت نگر میں مولانا کے خطابات سے عوام الناس مستفیض ہوتے۔

مولانا جہاں عربی میں صاحب دیوان شاعر ہیں وہیں بزبان اردو آپ کی نعوت اور مناقب اور قصائد ملتے ہیں،مختلف بحور کے چند اشعار اس طرح ہیں:

عید میلاد النبی ہے
ہر طرف چھائی خوشی ہے
دل ہمارا شادماں ہے
عید یہ سب سے بڑی ہے
دیکھا سب کچھ ہے یقیں جس نے مدینہ دیکھا
کس قدر اس پہ کرم حق کا نگینہ دیکھا
زمیں تا عرش فوق العرش بھی خطبہ محمد کا
خدا کے بعد ہے رتبہ تو بس رتبہ محمد کا
ہر اک عالم میں خواجہ پر کرم گستر محمد ہیں
زبان ودل میں جاری ہے سدا خطبہ محمد کا

مولانا کا تخلص خواجہ ہے۔اس کے علاوہ مولانا نے کئی تحقیقی مقالے بھی تحریر فرمائے جن کو آپ نے مختلف سمینار میں پڑھا، جیسے گلبرگہ اور جامعہ نظامیہ' اور مختلف جامعات میں مقالے پڑھے ہیں۔مولانا محمد خواجہ شریفؒ کے قائم کردہ ادارے اور تنظیمیں آج بھی بحسن وخوبی عربی واردو میں نمایاں کردار ادا کر رہے ہیں، مولانا کے ان خدمات سے ہر کوئی بآسانی اندازہ لگا سکتا ہے کہ مولانا کے اردو کے فروغ میں کس قدر حصہ رہا ہے۔اللہ تعالیٰ مولانا کی سعی کو قبول فرمائے۔

حوالہ جات:
۱۔ماثر شیخ الحدیث
۲۔القصیدۃ العطرۃ
۳۔حیات وخدمات عمدۃ المحدثین
۴۔گواہ ویکھی
۵۔نور المصابیح شرح زجاجۃ المصابیح
۶۔ثروۃ القاری من انوار البخاری شرح بخاری
۷۔انوار نظامیہ (سالنامہ مجلّہ جامعہ نظامیہ)

جہانگیر قیاس۔حیدرآباد

غزل

مال و زر اور نہ ہی دولت کو دَبا رکھتے ہیں
کچھ نہیں رکھتے مگر پاسِ وفا رکھتے ہیں
مشغلے یوں تو زمانے میں بہت ہیں لیکن
مشغلہ اپنا انہیں یاد سدا رکھتے ہیں
جانے آجائیں گے کب اپنے پرائے گھر کو
ہم بھی دروازے کو ہر وقت کھلا رکھتے ہیں
روشنی سے ہمیں کچھ ہو گئی نفرت اتنی
ہم سرِ شام چراغوں کو بجھا رکھتے ہیں
لاکھ نفرت کا سبق ہم کو زمانہ دے قیاسؔ
ہم مگر سینے میں چاہت کا دِیا رکھتے ہیں

نیہا نورین (نور) پی ایچ ڈی ریسرچ اسکالر یونیورسٹی آف حیدرآباد

راجہ گردھاری پرشاد باقی بحیثیت شاعر

اردو ادب کی تاریخ اگر ہم پڑھیں تو بہت سے ایسے شعراء ہیں جنہوں نے تاریخ کے پنّوں پر اپنے خوبصورت نشان چھوڑے ہیں اور اُردو شاعری کو درجہ کمال تک پہنچایا۔ ایسے ہی ایک شاعر راجہ گردھاری پرشاد باقی (بنسی راجہ) تھے۔ جن کا تعلق حیدرآباد دکن سے تھا۔ راجہ گردھاری پرشاد باقی نے جس زمانے میں نشو نما پائی اور جس ماحول میں آنکھ کھولی وہ نواب میر محبوب علی خان کا زمانہ تھا باقی فارسی کے بہترین شاعر تھے۔ چونکہ اس وقت فارسی کی روایت چلی آرہی تھی اس لیے باقی نے روایت کے مطابق فارسی زبان میں تعلیم حاصل کی اور فارسی کے ماہر بن گئے۔ فارسی زبان کے علاوہ وہ اردو پر بھی دسترس رکھتے تھے۔ یوں کہا جاسکتا ہے کہ باقی فارسی کے عمدہ سخن ور تھے تو وہیں اردو کے صف اول کے شاعر تھے۔

باقی شاعری میں شمس الدین فیض سے اصلاح لیا کرتے تھے اور خود کو ان کا شاگرد مانا کرتے تھے۔ باقی نے شاعری کی تمام اصناف میں طبع آزمائی کی قصائد، نعت، منقبت اور سلام، رباعیات، قطعات وغیرہ باقی نے فارسی اور اردو کے علاوہ ہندی میں بھی اشعار کہے۔ باقی نے خود کو فیض کا شاگرد کہا جس کا اعتراف انھوں نے اپنی غزلیات میں بھی کیا ہے۔

حضرت فیض کا سب ہے باقی پہلے
یہ سخن گوئی تھی ایسی نہ زبان دانی

وہ فیض کے سوا اور کلام کی حد تک کسی اور کے شاگرد خود کو نہیں سمجھتے تھے۔ فارسی میں باقی کے استاد محمد علی عاشق تھے۔ بحیثیت شاعر باقی کا جو مرتبہ رہا اس کو ان کے ہم عصر شعراء نے یوں بیان کیا ہے۔

خوش سیر، خوش وضع، خوش تقریر، خوش خو، خوش نصیب
خوش کلام، خوش مقال، و خوش خصال و خوش بیان

باقی کا دورِ شاعری وہ ہے جبکہ دبستان لکھنو عروج پر تھا اور دبستان دہلی بکھر چکا تھا۔ باقی نے ایک عالم کی حیثیت سے لکھنو اور دہلی دبستانوں کے اساتذہ کے کلام کا بخوبی مطالعہ کیا۔ باقی کے کلام کی سب سے اچھی خوبی حسن ادا، شائستگی تھی۔ باقی نے سلام بھی کہے تھے۔ ان کے سلام میں خیالات کے اظہار طرزِ ادا کا حسن، زبان کی سلاست یہ سب چیزیں ہیں جس نے ان کے سلاموں کا مرتبہ بلند کیا۔ باقی نے فارسی میں نعت بھی کہی۔ باقی نے اپنے دیوان بقائے باقی میں جو غزلیات لکھی اس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے کلام کا بیان لطیف و دلچسپ ہے۔

اگر چہ کہ باقی کا اردو کلام مختصر تھا۔ لیکن اُردو شاعری میں ان کا کلام خوشگوار اضافہ کی حیثیت رکھتا ہے، کہا جاتا ہے کہ باقی کا اصل سرمایہ ان کی غزلیات ہیں۔

فیضان فیض سے ہوئی دکن کی قدر
جب لکھنو سے لکھ کے ہماری غزل گئی

باقی کی غزلوں کا مطالعہ کرنے سے پتہ چلتا

ہے کہ وہ فطرتاً شاعر تھے اور محسوس ایسا ہوتا ہے کہ وہ غزل ہی کے لیے پیدا ہوئے تھے۔

آپ نے لطف سے جو نہ آنسو پونچھے ہوتے
دیکھتے پھر یہ میرا دیدہ تر کیا کرتا

باقی کی شاعری کی انفرادی خصوصیت یہ ہے کہ ان کی جو زبان ہے وہ پُر لطف ہے اور ان کی شاعری کی زبان دوسرے شعراء کی زبان سے مختلف ہے۔ باقی ہر بات کو بغیر کسی الجھاؤ کے صاف صاف بیان کر دیتے ہیں۔ سادگی، صفائی، انداز بیان، لطافت اور سلاست، ان کی انفرادیت ہے۔ باقی خود اپنی زبان پر ناز کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

شاگرد ہو جو باقی استاد شاعراں کے
ثانی تمہارا کوئی باقی نہیں دکن میں

باقی کی شاعری کے موضوعات دوسرے شعراء کے موضوعات کی طرح ملتے جلتے ہیں. جیسے کہ محبوب کا سراپا، محبت اور زندگی اس کی بے اعتنائی، زلفوں کا بیان، ان کے غزلوں میں پایا جاتا ہے۔ ان کا کلام جذبات سے بھر پور ہے۔ تشبیہات ان کے کلام کی خصوصیت ہے۔ محبت اور محبوب کی بے اعتنائی کے متعلق باقی لکھتے ہیں کہ:

بس آتے ہی اب روٹھ کے جانا نہیں اچھا
جانا نہیں اچھا ہے جانا نہیں اچھا
اچھا نہیں میں تم نے جو جانا نہیں اچھا

ایک شاعر کا کمال دراصل یہی ہوتا ہے کہ وہ کس طرح اپنے کلام کو لطف انداوز بنائے۔ باقی کے کلام کے مطالعہ سے یہ پتہ چلتا ہے کہ ان کا لطافت بیان کس قدر دلچسپ ہے۔

باقی گرچہ اردو سے زیادہ فارسی کی طرف مائل تھے۔ لیکن ان کا نظم ونثر سرمایہ فارسی ہی میں ہے۔ نثر اور نظم کی جملہ 31 کتابیں باقی نے لکھی۔

باقی کی شاعری کے متعلق پون کماری رقمطراز ہیں:

''باقی شاعری میں محاورے اس خوبصورتی اور برجستگی کے ساتھ برتتے ہیں جیسے کوئی دہلوی الاصل شاعر برتتا ہے۔ ان کا اسلوب بیان بھی ان کی زبان کی طرح سادہ ہے۔ مگر جہاں تک مضمون آفرینی کا تعلق ہے. ان کے یہاں وہی گنگا جمنی طرز فکر ملتا ہے. انہوں نے دونوں دبستانوں کی شعری روایت سے استفادہ کیا ہے. چناں چہ ایک شعر میں وہ میر کی پیروی کا ذکر کرتے ہیں''

جناب میر کا پیرو ہوں باقی
مرے شعر و سخن میں کیا اثر ہے

(ایضاً: راجہ گردھاری پرشاد باقی اور ان کے خاندان کی اردو خدمات از پون کماری ص نمبر 111)

باقی کی شاعری پڑھ کر یہ ضرور کہا جاسکتا ہے کہ باقی میں ایک فطرتاً اور ایک شاعر کا دل پایا جاتا ہے۔ باقی کے کلام میں بعض جگہ حضرت داغ کا رنگ نمایاں ہے۔ ان کے نعتیہ کلام میں انہوں نے جس عقیدت سے الفاظ کا جامعہ پہنایا ہے۔ کسی بھی خیال کو اشعار میں بڑی خوش اسلوبی اور انوکھے پن سے ادا کرتے ہیں۔ ان کے کلام میں عشق حقیقی اور عشق مجازی دونوں ملتے ہیں۔ سلاست اور برجستگی باقی کے کلام کے اہم اجزاء ہیں۔

باقی زبان کے شاعر ہی نہیں بلکہ ان کی شاعری میں صداقت اور خلوص جذبہ بھی کارفرما ہوتا ہے۔ ان کے

کلام میں حد سے زیادہ دلکشی خلوص اور صداقت واضح طور پر نظر آتا ہے۔ بقول ڈاکٹر بھاسکر راج سکسینہ:

''باقی کے کلام کی خصوصیت یہ ہے کہ ایک طرف وہ اپنے پروردگار اور اس کی ساری کائنات سے بے پناہ عقیدت اور محبت رکھتے ہیں. تو دوسری جانب اپنے ماحول سے بہرہ نہیں۔ انھوں نے ہندوؤں اور مسلمانوں کی معاشرت اور ہندوستان کی تہذیبی و دینوی رجحانات کا مطالعہ کیا. اور پھر اس سماج کے نمائندہ بن کر اپنے شعر وسخن میں اس کی نمائندگی کی'' (بھاسکر راج سکسینہ، حیدرآباد کے بنسی راجہ، اسپیڈ پرنٹس حیدرآباد)

بقائے باقی ان کا دیوان 92 غزلوں ایک مخمس اور 16 سلاسوں پر مشتمل ہے۔

دل میں دنیا کا تماشا دیکھا
موجزن کو زے میں دربار دیکھا

باقی کی شاعری کے مطالعے کے بعد راقم کو محسوس ہوا کہ باقی کو ہم ایک بہترین غزل گو شاعر کہہ سکتے ہیں چونکہ غزل ویسے واردات عشق ومحبت کی شاعری ہے. یہ اور بات ہے کہ آج کل غزل میں زمینی موضوعات بھی شامل ہیں۔ شاعر کی غزل میں عشق ومحبت کے حقیقی جذبات کا عکس کم ملتا ہے۔ باقی کی غزلوں کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ ان کا دل درد آشنا تھا اور وہ عشق کے لذت والم سے واقف تھے۔ ان کی غزلوں میں ایسے اشعار ملتے ہیں جنھیں دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ یہ صرف رسمی شاعری نہیں بلکہ ان اشعار کے پیچھے حقیقی اور شدید تاثرات موجود ہیں۔ بقائے باقی کے آخر میں 17 سلام بھی شامل ہیں۔ سلام شکل اور ساخت کے لحاظ سے غزل سے مشابہت رکھتا ہے اور مرثیہ کی بہ نسبت زیادہ صاف اور سلیس ہوتا ہے۔ ان کے سلام میں خیالات کا تنوع بھی ہے اور طرز ادا کا حسن بھی ہے:

درد باقی وورد ساقی کے نام سے ان کی ایک اور اردو تصنیف کا ذکر کیا ہے. جو خواجہ درد کی تقریباً دو سو فارسی رباعیات کا اردو رباعیوں میں ترجمے پر مشتمل ہے۔ اس کتاب کے آخر میں خود باقی نے بھی اپنی سوا سو فارسی اور چار اردو رباعیاں شامل کی تھیں. درد کی رباعیاں تصوف سے مالا مال ہے۔ یہ رنگ باقی کے مزاج سے مناسبت رکھتا تھا۔ اس لئے انھوں نے درد کا اتنا اثر قبول کیا کہ خود ان کی فارسی رباعیاں بھی درد کی رباعیوں کا نقش بن گئیں۔

سب سمجھتے اور ہیں حالت ہماری اور ہے
اور بیماری ہے کچھ بیمار داری اور ہے

جفا کر کے دل کو نہ میرے دکھا
کہ باقی ترا ایک جاں باز ہے

دوسرے شعرا کی طرح باقی نے بھی میر تقی میر کے پیرو رہے۔ خواجہ میر درد کی دو سو رباعیوں کا انھوں نے اردو میں ترجمہ کیا تھا۔ ان رباعیات کو پڑھنے سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ترجمہ نہیں بلکہ اصل رباعی ہے۔ ان رباعیات کو فارسی کے ساتھ باقی کے فرزند راجہ نرسنگ راج عالی نے ''درد باقی وورد ساقی'' کے نام سے مرتب کر کے سن 1922 میں طبع کروایا۔ باقی نے ملکہ وکٹوریہ کی شہنشاہیت کے اعلان کے سلسلے میں جو دربار دہلی میں ہوا تھا۔ اس وقت فارسی میں ایک نظم لکھی تھی۔ نظم ملاحظہ فرمائیں:

اس دم کا کیا بھروسہ آخر اسے فنا ہے
ہوجائے گی گھڑی بند اک بار چلتے چلتے

خوشبو پروین۔ ریسرچ اسکالر، یونی ورسٹی آف دہلی

رباعی کائنات کا فرد قلندر، حافظ کرناٹکی

امجد حسین اصل نام اور قلمی نام حافظ کرناٹکی ہے۔ ان کی پیدائش ۱۸ر جون ۱۹۶۴ء کو شکاری پور سیموگہ کرناٹک میں ہوئی۔ ان کے والد کا نام نذیر پاشاہ اور والدہ بصیر النساء بیگم ہیں۔ امجد حسین حافظ کرناٹکی اردو رباعی گوشعرا کی فہرست میں ایک اہم مقام رکھتے ہیں۔ رباعی ایک مشکل فن ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اردو شاعری میں رباعی کہنے والوں کی تعداد ہمیشہ سے کم رہی ہے۔ رباعی چونکہ اردو شاعری کی اہم صنف ہے اور دوسرا یہ کہ رباعی کے چار مصرعوں میں وہ سب کچھ کہنا پڑتا ہے جو کہ ایک مکمل نظم یا غزل کے ایک شعر میں ہوتا ہے۔ اس کے باوجود پھر یہ کہ رباعی کے چوتھے مصرعے کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ بہرحال رباعی کے فن میں جہاں ایک طرف ناوک حمزہ پوری، ظفر کمالی، قمر سیوانی، اصغر ویلوروی وغیرہ کو اہمیت حاصل ہے وہیں ایک نمایاں نام حافظ کرناٹکی کا بھی ہے۔ یوں تو حافظ کرناٹکی ادب اطفال کے بے تاج بادشاہ کہے جاتے ہیں۔ چونکہ انہوں نے ادب اطفال پر بہت نمایاں کام انجام دیئے۔ درجنوں کتابیں لکھیں اور ساتھ ہی بہت سے انعامات سے بھی نوازے گئے۔ ان کی یہ خدمات تو اپنی جگہ ہیں لیکن وہ بحیثیت شاعر اپنا منفرد مقام رکھتے ہیں۔ اردو شاعری کی مختلف اصناف کے علاوہ فن رباعی میں بھی انہیں کمال حاصل ہے۔

اردو رباعی میں حافظ کرناٹکی کا مقام اہمیت کا حامل ہے۔ ان کا یہ اہم مقام ان کی رباعی کے معیار و مقدار کی وجہ سے ہے۔ وہ اب تک کئی ہزار رباعیاں کہہ چکے ہیں جن میں رباعیات حافظ حصہ اول جولائی ۲۰۱۱ء، رباعیات حصہ دوم ۲۰۱۵ء، رباعیات حصہ سوم مئی ۲۰۱۶ء اور رباعیات حصہ چہارم مئی ۲۰۱۶ء شامل ہیں۔ ان کی رباعیوں کی تعداد تقریباً سات ہزار کے قریب ہے۔

رباعیات حافظ حصہ اول میں اگر ہیئت کے حوالے سے بات کی جائے تو موصوف نے زیادہ تر رباعیاں رباعی کی ایک مخصوص بحر میں کہی ہیں جبکہ حصہ دوم، سوم اور چہارم میں شاعر نے اپنے فن کا مظاہرہ کرتے ہوئے مختلف بحور میں اپنے جوہر دکھائے ہیں۔

رباعیات حافظ حصہ اول اور دوم دونوں مجموعوں میں مضمون کے اعتبار سے جو ترتیب دی گئی ہے وہ یہ کہ سب سے پہلے خدا کی حمد و ثنا پھر محبوب خدا محمدؐ کی حیات کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کیا گیا ہے۔ چند حمدیہ اور نعتیہ رباعیاں دیکھئے:

طوفاں کے بہاؤ کو بھی شبنم بولے
چھائی رہے خاموشی زباں کم بولے
سجدہ نہ کسی کے آگے ہو کبھی
بولے تو بس اللہ کو ہمدم بولے

☆

غیب کے ہاتھوں سے رسد لیتے ہیں
توحید پرستی کی سند لیتے ہیں

سجدہ نہیں کرتے کبھی غیر اللہ کو
اللہ سے مشکل میں مدد لیتے ہیں

☆

ہر چیز میں ہر شے میں ظہور اس کا
سورج قمر تاروں میں نور اس کا
ایک ایک بجلی کا وہی ہے محور
وہ جلوۂ منور ہے طور اس کا

☆

وہ چاہے جب دیکھ لیا جاتا ہے
کب سب کو یہ اعجاز دیا جاتا ہے
جو عقل کے اندھے ہیں وہ کیا سمجھیں گے
اللہ کو محسوس کیا جاتا ہے

☆

ہر شے نے محمدؐ سے فضیلت پائی
مزدور کو حق مل گیا اجرت پائی
دل نے بھی سلیقے سے دھڑکنا سیکھا
انسان کے کردار نے عظمت پائی

☆

رخ آپ کا قرآن نظر آتا ہے
اللہ کی پہچان نظر آتا ہے
بوجہل نے بھی آپ کو دیکھا تو کہا
یہ منبع ایمان نظر آتا ہے

☆

ایمان کی معراج ہے سیرت ان کی
برتر کے لئے تاج ہے سیرت ان کی
دوزخ سے نکالے گی جو حافظ ہم کو
وہ صورت اخراج ہے سیرت ان کی

☆

آدمؑ کی دعاؤں کا وسیلہ ہیں نبیؐ
اور حضرتِ عیسیٰؑ کی تمنا ہیں نبیؐ
حاصل ہوئی معراجِ نبوت ان کو
مہمانِ الٰہی شبِ اسریٰ ہیں نبیؐ

حافظ کرناٹکی ایک قادر الکلام رباعی گو اور فنکار ہیں۔انہیں زبان پر دسترس حاصل ہے۔لفظوں کے انتخاب اور استعمال میں ان کا کوئی جواب نہیں۔وہ ایک ہی بات کو کئی ڈھنگ سے ادا کرتے ہیں۔چند رباعیات ملاحظہ فرمائیں:

جو ہونا ہے ہوگا وہ ہوا کرتا ہے
سیدا سبھی اسباب خدا کرتا ہے
قادر ہے وہ ہر شے پہ ہے قدرت اس کی
کیا بندۂ مجبور خدا کرتا ہے

☆

صالح ہیں خیالات کرم ہے رب کا
دل میں نہیں خدشات کرم ہے رب کا
سلجھے ہوئے افکار ہیں زیر خامہ
شفاق میں رشحات کرم ہے رب کا

☆

جو کوئی مدینے کا سفر کرتا ہے
فردوس میں تعمیر وہ گھر کرتا ہے
کھل جاتے ہیں رحمت کے خزانے حافظ
اس شخص پہ رب خاص نظر کرتا ہے

☆

کہتے ہیں کرم حق کا ادا کردینا
کچھ مانگنے سے پہلے عطا کردینا
امید نہیں رکھنا صلے کی حافظ
ہر گام پہ اوروں کا بھلا کردینا

حافظ کرناٹکی صاحب نے اپنی رباعیوں میں لفظوں کا انتخاب اور استعمال بہت ہی سوچ سمجھ اور ناپ تول کر کیا ہے۔ مصرعوں کی ترتیب بھی نہایت سلیقے سے کی ہے۔

حافظ کرناٹکی کی رباعیوں کے مطالعہ سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اس راہ سے کامیاب وسرفراز گزرے ہیں۔ وہ نہ صرف رباعی گوئی کے فن سے واقف ہیں بلکہ عروضی گرفت بھی رکھتے ہیں۔ موصوف کو رباعی پر اس طرح دسترس حاصل ہوچکی ہے کہ وہ پیچیدہ خیال کو بھی بڑی آسانی سے مؤثر انداز میں پیش کردیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ موصوف کا شمار ملک کے چنندہ رباعی گو شعرا میں ہوتا ہے۔ ان کی چند رباعیاں دیکھئے:

وہ پالنے والا ہے اسے رب کہئے
ایمان کا اجالا ہے اسے رب کہئے
سمجھا نہیں سکتی اسے کوئی بھی مثال
آپ اپنا حوالہ ہے اسے رب کہئے

☆

اللہ کا فرمان نظر میں رکھو
ہر حال میں قرآن نظر میں رکھو
ایمان کو مت ڈولنے دینا اپنے
تم حشر میں میزان نظر میں رکھو

اس مادی دنیا میں انسان اللہ کی بندگی سے دور ہوتا جارہا ہے۔ صبر کے دامن کو چھوڑ چکا ہے۔ ان چیزوں کو چھوڑ چکا ہے جن کا حکم اللہ نے بار بار قرآن میں کیا، لیکن جو اللہ والے ہیں، ایمان والے ہیں انہوں نے راہ خداوندی سے اپنا منہ نہیں موڑا جسے حافظ کرناٹکی صاحب نے بڑی خوبصورتی سے استعمال کیا ہے۔ ایک رباعی دیکھئے:

جو رب کے توکل پہ جیا کرتے ہیں
دنیا سے وہ کب کچھ بھی لیا کرتے ہیں
لالچ سے چھلکتی نہیں نیت ان کی
وہ صبر سے دو گھونٹ پیا کرتے ہیں

امجد حسین کرناٹکی کی رباعیوں میں محاورے بھی بڑی چابکدستی کے ساتھ استعمال ہوئے ہیں۔ نمونہ دیکھئے:

کوئی بھی نہ ہو جس کا خدا ہے اس کا
ہر حال میں رکھوالا خدا ہے اس کا
رب جس کو رکھے اس کو بھلا کون چکھے
وہ اس کو بچالے گا خدا ہے اس کا

قرآن مکمل راہ ہدایت ہے، جسے اللہ نے ہمارے لئے بھیجا ہے تاکہ ہم اس طرز پر زندگی گزار کر اپنی دنیا اور آخرت دونوں سنوار سکیں۔ قرآن تمام امت مسلمہ کے لئے ایک نایاب تحفہ ہے اور حضور پاکؐ کی زندگی سراپا تفسیر قرآن ہے۔ شاعر نے انہی خیالوں کو مدنظر رکھتے ہوئے رباعی کہی ہے:

قرآن سی دولت ہمیں اللہ نے دی
کتنی بڑی دولت ہمیں اللہ نے دی
جینے کا سبق پائے احادیث سے ہم
محبوبؐ کی سنت ہمیں اللہ نے دی

حافظ کرناٹکی کے یہاں تلمیحی رباعیاں بھی دیکھنے کو ملتی ہیں۔ انہوں نے اپنی ایک رباعی میں حضرت موسیٰ

علیہ السلام کا واقعہ بڑی حسن اسلوبی کے ساتھ پیش کیا ہے۔جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ کو دیکھنے کی خواہش کا اظہار کیا اور جب اللہ نے دکھانا چاہا تو وہ تاب نہ لاسکے اور غش کھا کر گر گئے تھے۔رباعی دیکھئے:

اس آنکھ کو چمکاتے ہیں جلوے رب کے
جس کو بھی نظر آتے ہیں جلوے رب کے
موسیٰ کو بھی تڑپایا اس جلوے نے
ہر دل میں اتر جاتے ہیں جلوے رب کے

حافظ کرناٹکی اپنی رباعیوں میں ماں کی خدمات اور ان کی عظمت و رفعت کا بیان کرتے ہیں جن سے شاعر قاری کے دل میں ماں کے تئیں محبت اور عزت و احترام کا جذبہ ابھارتا ہے۔اس موضوع پر بھی حافظ صاحب کے یہاں خاصی تعداد میں رباعیاں ملتی ہیں جن کا سلسلہ ابھی بھی جاری ہے۔چند رباعیاں دیکھئے:

ہر گل کو گلستاں کیا ہے ماں نے
بے مول کو ذی شان کیا ہے ماں نے
ممکن ہی نہیں حشر تلک اس کا جواب
بچوں پہ جو احسان کیا ہے ماں نے

☆

قسمت کی بلندی ہے ترے قدموں میں
خوش خبری عدن کی ہے ترے قدموں میں
اے ماں تری عظمت کو فضیلت کو سلام
بخشش بھی ہماری ہے ترے قدموں میں

☆

ہر بچہ سنور جاتا ہے ماں کے ہاتھوں
یہ معجزہ پیش آتا ہے ماں کے ہاتھوں
بچپن کے زمانے سے جوانی تک بھی
تکمیل بشر پاتا ہے ماں کے ہاتھوں

مذکورہ بالا رباعیوں میں ماں اور بچپن کے تعلقات کو واضح کیا گیا ہے۔انہوں نے اپنی رباعیوں میں ماں سے تعلق عمر کے ہر دور میں برقرار رکھنے کی کوشش کی ہے اور ان کے احسانات کو ان کی دعاؤں کی شکل میں پیش کیا ہے۔یہ بات سچ ہے کہ ماں کی دعاؤں کی وجہ سے انسان بلندیوں تک بآسانی پہنچ سکتا ہے۔اس لئے ماں کی عظمت، ان کا احترام ہر فرد کے لئے ضروری ہے۔جس طرح خدا کی نعمتوں کو کھا کر ہم اس کا شکر ادا کرتے ہیں اسی طرح ماں نے جو تکلیفیں ہمارے لئے اٹھائی ہوتی ہیں ان کا بھی شکریہ ادا کرنا ضروری ہے۔خدا کا شکر جس طرح ہم عبادت کے ذریعہ ادا کرتے ہیں اسی طرح ہمیں ماں کا شکریہ خدمت کے ذریعہ ادا کرنا چاہئے۔ان کی ایک رباعی دیکھئے:

کب ہم سے ادا ہوگا اس احساں کا بدل
ماں کی کسی ایک شام پریشاں کا بدل
قدرت کی گراں قدر امانت ہے ماں
دنیا کی کوئی چیز نہیں ماں کا بدل

حافظ کرناٹکی کی نظر زندگی کے ہر شعبہ پر ہے۔ان کے یہاں ہر موضوع پر کثیر تعداد میں رباعیاں ملتی ہیں۔ان کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ اپنی رباعیوں میں ان چیزوں کی جانب توجہ دلاتے ہیں جو لوگوں کی روزمرہ زندگی میں داخل ہوتی ہیں۔چند متفرق رباعیاں دیکھئے:

اب شرم و حیا کی نہیں کوئی قیمت
آنچل یا ردا کی نہیں کوئی قیمت

جاری ہے یہاں جلوہ نمائی کا رواج
جلوؤں سے وفا کی نہیں کوئی قیمت

☆

ہر شہر میں اب گاؤں بسایا جائے
اک سادہ سا ماحول بنایا جائے
اخلاص وفا معیار محبت، چاہت
کھوئی ہوئی ان چیزوں کو پایا جائے

☆

ہر خواب کی تعبیر نہیں ہو سکتی
ہر بات کی تفسیر نہیں ہو سکتی
جو دل میں پلا کرتے ہیں زخموں کی طرح
ان رازوں کی تشہیر نہیں ہو سکتی

☆

دل بن کے دھڑکتا ہے کوئی سینے میں
گل بن کے مہکتا ہے کوئی سینے میں
سورج کی طرح اور کبھی شعلے کی طرح
دن رات دہکتا ہے کوئی سینے میں

مجموعی طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ حافظ کرناٹکی کا مشاہدہ اور مطالعہ کافی گہرا ہے اور دینی فہم وفراست سے آراستہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جذبات واحساسات کے اظہار میں دینی رجحان غالب نظر آتا ہے۔ حافظ کرناٹکی کے یہاں الفاظ کی چابکدستی، معنی آفرینی، مضمون کی رنگارنگی پائی جاتی ہے جس نے ان کی رباعیوں کو ہمہ گیر حیثیت کا حامل بنادیا ہے۔ جس کی وجہ سے وہ ایک کامیاب رباعی گو کی حیثیت سے افق ادب پر جلوہ گر ہیں اور اپنے ہم عصروں میں منفرد حیثیت کے حامل ہیں۔

محمد نعیم کوثر رشادی۔ محبوب نگر، تلنگانہ

غزل

بہت نزدیک آجانے سے فرقت اور بڑھتی ہے
کوئی جب دور ہوتا ہے تو چاہت اور بڑھتی ہے
تری تنقید مجھ کو پس ہمت کر نہیں سکتی
پتہ مجھ کو تنقیدوں سے ہمت اور بڑھتی ہے
چلو چل کر انہی سے پوچھتے ہیں دشمنی ہے کیوں
زمانے بھر میں کہنے سے عداوت اور بڑھتی ہے
وہ غصہ کر کے لوگوں کو بہت مسرور ہوتے ہیں
بتاؤ ان کو غصہ میں حماقت اور بڑھتی ہے
بڑے کہتے ہیں سچ کہنے سے رسوائی نہیں ہوتی
یقیناً جھوٹ کہنے سے خجالت اور بڑھتی ہے
اکیلے میں ہم ان کی یاد میں روتے ہیں جی بھر کر
جب ان کا نام لیتے ہیں تو رقت اور بڑھتی ہے
نگاہوں کی حفاظت کر کے ہم نے بار دیکھا
مرے بھائی عبادت میں حلاوت اور بڑھتی ہے
کلام پاک پڑھئے، خوب پڑھئے، دیکھ کر پڑھئے
ذہانت کھلتی جاتی ہے بصارت اور بڑھتی ہے
نہیں دنیا، کے پیچھے بھاگنے سے کچھ نہیں ملتا
چلو کچھ مل بھی جاتا ہے تو حسرت اور بڑھتی ہے
خدا کے نام پر دینا ہے گویا خود کو ہی دینا
خدا کی راہ میں دینے سے دولت اور بڑھتی ہے
کسی اللہ والے کا یہ جملہ یاد ہے کوثرؔ
کسی کے ہو کے دیکھو رب سے قربت اور بڑھتی ہے

سیدہ تبسم منظور ناڈکر۔ممبئی

آن لائن ہوتی زندگی آف لائن ہوتے رشتے

کسی نے کیا خوب کہا ہے کہ گزرا ہوا زمانہ آتا نہیں دوبارہ۔۔۔۔

سچ ہے کہ جو وقت گزر چکا سو گزر چکا۔ ہم گزرے ہوئے زمانے پر نظر دوڑاتے ہیں تو یاد آتا ہے کہ ایک وہ بھی وقت تھا جب کسی کے بھی گھروں میں نہ فون تھا، نہ ٹی وی، نہ اور کوئی الیکٹرانک چیز۔ کسی کسی کے گھر میں ریڈیو ہوا کرتا تھا اور ایکہ دوکہ کے گھر میں بلیک اینڈ وائٹ ٹی وی۔ وقت گزارنے کا ذریعہ صرف کتابیں تھی یا پھر اِن ڈور یا آوٹ ڈور گیم۔ ہر کام اپنے ہاتھوں سے کیا جاتا تھا اور سارے ہی کاموں میں خوب محنت ومشقت لگتی تھی۔ گھر کے سارے لوگوں کا ساتھ ساتھ اٹھنا، بیٹھنا، کھانا، پینا، ایک دوسرے کے غم اور خوشی میں شریک ہونا ہوتا تھا۔ روٹھنا، منانا، گھر کے سارے بچوں کا ایک ساتھ سونا، ہنسی مذاق کرنا۔۔۔۔وہ بھی کیا دن تھے جب رشتوں میں پیار، محبت، خلوص، احساس ہوا کرتا تھا۔ گھر چھوٹے ہوتے تھے مگر دلوں میں جگہ ہوتی تھی۔ ایک گھر میں کئی بھائیوں کے خاندان رہتے تھے وہ بھی سب مل جل کر۔۔۔۔۔ بزرگوں کے ڈانٹنے پر کبھی کوئی برا نہیں مانتا تھا۔ غلطی ہو یا نہ ہو سر تسلیم خم ہو جاتا۔ یہ ایک تہذیب تھی جو صدیوں پر محیط تھی۔ تعلیم یافتہ ہونے یا نہ ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ لوگ میلوں کا سفر کر کے ایک دوسرے سے ملنے آتے تھے، تب اتنے وسائل بھی نہیں تھے۔ وقت نے انسانی رشتوں کے احترام کو کم ہی متاثر کیا تھا۔

پھر زمانے نے کروٹ لی۔۔۔۔۔۔ یہ کروٹ بھی عجیب کروٹ ہے۔۔۔ پہلے سماج میں تعلیم یافتہ افراد کی تعداد کم ہی رہتی تھی۔ پھر دھیرے دھیرے یہ تعداد بڑھنے لگی۔ پہلے لوگوں میں علم کم تھا اور عمل زیادہ تھا۔۔۔۔۔۔ آج سب کے پاس بڑی بڑی ڈگریاں ہیں مگر عمل نہیں ہیں۔ زمانے کی ضروریات بدلیں تو لوگوں کی نظر اور نظریات بھی بدلتے چلے گئے۔۔۔۔۔۔۔ اور آج یہ حال ہے کہ لوگوں کے دلوں میں ہی جگہ نہیں رہ گئی تو گھروں میں کیا ہوگی۔ پہلے کھانا بنایا جاتا تو دو چار مہمان بھی آجائیں تو کوئی فرق نہ پڑتا۔ اب چار لوگوں کا کھانا بنا ہے اور ایک مہمان آجائے تو سوچ میں پڑ جاتے ہیں۔ برکت بھی ختم ہوگئی۔۔۔۔۔ وہ اس لئے کہ پہلے لوگ مہمان کا آنا خوش نصیبی سمجھتے تھے۔ اب مہمان کا آنا بوجھ لگتا ہے۔ مہمان اپنی روزی خود ساتھ لے کر آتا ہے۔۔۔ پر اب کون سمجھتا ہے۔

آج کے بچوں کو آوٹ ڈور گیم کھیلنا تو دور انہیں پتہ بھی نہیں ہے کہ آوٹ ڈور گیم کون کون سے ہیں جو گلی محلوں میں کھیلے جاسکتے ہیں۔ انہیں یہ سب پتہ ہے کہ موبائل پر کون کون سے گیم ہیں۔ ہم اپنے بچوں کو انٹرنیٹ اور شوشل میڈیا سے دور رکھنا چاہتے تھے۔ اسکول میں جب کسی طالب علم کے پاس موبائل ملتا تو ضبط کیا جاتا کہ اسکول میں موبائل لانا منع ہے۔ پر دیکھیں کہ اسکول ہی موبائل

میں آ گیا ہے۔ آج تین سال کا بچہ بھی آن لائن کلاس لے رہا ہے۔ سب کچھ آن لائن ہو گیا۔ بینک سے لے کر خریداری تک۔ یہاں تک کہ اگر آپ چائے بھی پیتے ہوں تو آن لائن پیمنٹ۔ ساری دنیا آن لائن ہو گئی ہے۔

سوشل میڈیا نے ہمیں بہت سارے لوگوں سے جوڑ دیا ہے۔ بہت ساری آسانیاں بھی ہوئیں لیکن اس کا ایک نقصان دہ پہلو یہ بھی ہے کہ ہماری زندگی جتنی زیادہ آن لائن ہو رہی ہے، ہمارے رشتے اتنے ہی آف لائن ہوتے جا رہے ہیں۔ ہم اپنوں کے درمیان میں بیٹھ کر بھی ان لوگوں سے قریب ہونا پسند کرتے ہیں جن سے نہ کبھی ملاقات ہوئی ہے نا ملاقات ہونا ممکن ہے۔ موبائل کی غیر حقیقی یعنی ورچوئل دنیا میں داخل ہو کر ہم اپنے حقیقی رشتوں سے دور ہوتے جا رہے ہیں۔ پہلے ہم اپنے حقیقی رشتوں سے جڑے ہوئے تھے مگر آن لائن رشتوں کی وجہ سے آپسی اور حقیقی رشتے بکھرتے جا رہے ہیں۔ رشتوں میں تلخیاں بڑھنے لگی ہیں۔ ہم جسمانی طور پر اپنوں کے ساتھ بیٹھے بھی ہو تو ذہنی طور پر ہم وہاں نہیں ہوتے کیونکہ ہماری نگاہیں موبائل کی اسکرین پر ہوتی ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ انسانی معاشرے کی اساس تعلق، رشتوں کے قیام پر ہے۔ لیکن ترقی کے اس دور میں نفسانفسی بڑھ چکی ہے اور لوگ آپسی تعلقات کو بوجھ سمجھتے ہوئے اس سے فرار اختیار کر رہے ہیں۔ آن لائن ہوتی زندگی پر زیادہ توجہ دے رہے ہیں اور حقیقی رشتے آف لائن ہو رہے ہیں۔ سوشل میڈیا کے اس دور میں موبائل فون کا استعمال اس قدر زیادہ ہو گیا ہے کہ اسمارٹ فون استعمال کرنا ہم سب کی اولین ترجیح بن گئی ہے۔ اس کا اثر یہ ہوا ہے کہ انسان موجود تو کہیں ہوتا ہے لیکن اس کی توجہ کہیں اور ہوتی ہے۔ نگاہ موبائل پر، ہونٹوں پر مسکراہٹ، کبھی اپنی تصویر پر ڈھیروں لائیکس دیکھ کر، تو کبھی بہت سارے کمینٹس پا کر ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے سب کچھ حاصل کر لیا ہو۔ سوشل میڈیا نے ہمیں بہت سے جانے انجانے لوگوں سے آسانی سے جوڑ تو دیا ہے لیکن اپنوں سے دور کر دیا ہے۔ ہماری زندگی جتنی آن لائن ہو رہی ہے ہمارے رشتے اتنے ہی آف لائن ہوتے جا رہے ہیں۔

سوشل میڈیا پر ہم نئے نئے لوگوں سے ملتے ہیں۔ ان کے بارے میں بہت کچھ جاننے کے لئے بے چین رہتے ہیں۔ ان کی پسند ناپسند، ان کی ذاتی زندگی سے متعلق جاننا چاہتے ہیں۔۔۔۔۔۔ اور سامنے والے بھی اتنی ہی دلچسپی لیتے ہیں جس سے ہم خود کو خاص محسوس کرتے ہیں۔ ہمیں یہ سب بے حد اچھا لگتا ہے کیونکہ روز کچھ نہ کچھ نیا ہو رہا ہوتا ہے۔ ہمیں روز دوسروں کے بارے میں نئی باتیں جاننے کو ملتی ہیں۔ لیکن افسوس ہم اپنے گھر والوں کی پسند اور ناپسند جاننے کی کوشش بھی نہیں کرتے۔

موجودہ وقت میں انسانوں نے آن لائن رشتوں کو اولیت دے دی ہے۔ پورے گھر کے لوگ جمع ہوں تو سب موبائل میں خاموشی سے لگے رہتے ہیں۔ ان آن لائن رشتوں پر جو اَن دیکھے ہیں، عارضی ہیں اور ناپائیدار ہیں اور جن سے متعلق ہماری کوئی جوابدہی بھی نہیں ہے، ہم حقیقی رشتوں کو بھولتے جا رہے ہیں جنھیں اب آف لائن رشتے کہا جاتا ہے۔ جو ہمارے آس پاس ہوتے ہیں۔ جنہیں ہم دیکھتے اور محسوس کرتے ہیں۔ ان رشتوں سے متعلق ہماری جوابدہی بھی ہے۔ سوچیے اگر ماں نے آن لائن رہتے ہوئے بچوں پر دھیان کم کر دیا تو یہ اس کا زندگی کا

سب سے بڑا نقصان ہے اور اس کے برے اثرات اولاد پر تاحیات قائم رہیں گے۔ بزرگوں کا لحاظ، اپنوں سے محبت، ان کی عزت، ان کا کہنا ماننا، ان کا خیال رکھنا کبھی ہمارا وصف اور امتیاز ہوتا تھا مگر آج کے اس مشینی دور میں یہ سب ایک خواب بن کر رہ گیا۔ یا اسے ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ اب ہمارا یہ کام بھی غیروں نے سنبھال لیا ہے۔ پہلے دور میں برگد کے پیڑ کے نیچے بیٹھک بنی ہوتی تھی۔ وہاں بڑے بزرگ جمع رہتے تھے۔ وہاں سبھی کے مسائل کا حل نکالتے ہوئے اہم فیصلے کر لیے جاتے تھے۔ آج ترقی کے اس دور نے اس برگد کے درخت کو کاٹ کر رشتوں کا تقدس، پیار، احساس، مروت اور دلوں کی مٹھاس کو جڑ سے اکھاڑ دیا ہے۔ دلوں میں فاصلے ہوگئے ہیں۔ ایک ہی گھر میں رہتے ہوئے لوگ اجنبی بن گئے ہیں۔ کبھی تو ہزاروں میل کے فاصلے بھی کچھ نہیں ہوتے تھے۔ آج ایک دوسرے کے پاس ہو کر بھی ہزاروں میل دور ہوگئے ہیں۔ غم ہو یا خوشی بس موبائل پر میسج کر دیا مطلب ذمہ داری پوری ہوگئی۔

ہم اپنے خونی رشتوں سے دور ہو کر موج مستی میں جوانی تو گزار سکتے ہیں مگر بڑھاپا نہیں۔۔۔۔۔۔ ٹیکنالوجی کے ذریعے پوری دنیا کو ایک کلک کا مرہون منت کر دیا گیا ہے۔ آج ہم بھری محفل میں بھی تنہا بیٹھ کر آن لائن ہوتے ہیں۔ فیس بک، ٹوئیٹر، انسٹاگرام اور دیگر ویب سائٹس پر موجود لاکھوں لوگوں کو اپنے حلقہ احباب میں شامل کر لیا ہے جب کہ اصل زندگی اس کے برعکس ہے۔ حقیقی زندگی میں اب ہمیں زندگی کی خوب صورتی کا احساس نہیں رہ گیا ہے۔ ہمیں اس دور میں اپنے آپ کو پرکھنے اور جاننے کی اشد ضرورت ہے کہ ایک دوسرے سے محبت سے

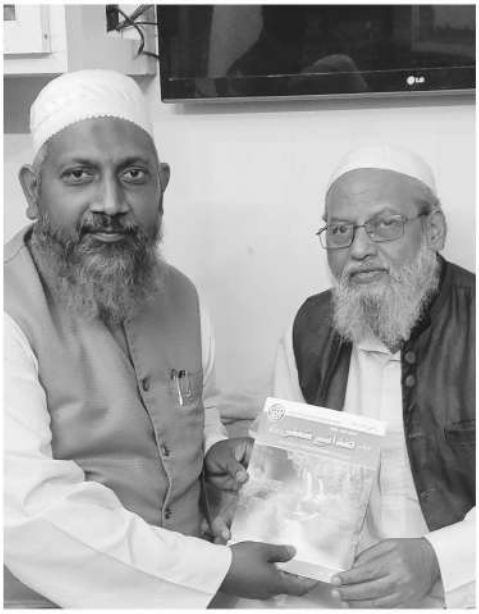

شہنشاہِ قلم وادب ڈاکٹر نادر المسدوسی کے ہاتھوں میں ماہنامہ صدائے شبلی

پیش آئیں۔ لیکن ہم نے تو پیار، محبت، مروت، لحاظ اور تقدس کو پیچھے کہیں چھوڑ دیا ہے!!!!

تعلق اور رشتے صرف عزت و توجہ اور اہمیت کے محتاج ہوتے ہیں۔ اس لئے ان کی جتنی قدر و منزلت کی جائے اتنے ہی وہ گہرے اور مضبوط ہوتے چلے جاتے ہیں لیکن ہم سب اپنی زندگی کے مسائل، مصائب اور آن لائن میں الجھ کر اپنے ان رشتوں اور اہم خونی رشتوں کی خدمت سے بھی محروم ہوتے جا رہے ہیں۔ اس خدمت کا قرض اپنے کندھوں پر اٹھائے پھرتے ہیں پھر ایک دن اس دنیا سے رخصت ہو جاتے ہیں۔ ہماری پوری زندگی آن لائن ہوگئی ہے اور ہمارے رشتے آف لائن ہوگئے ہیں۔ سوچیں!!!!! نفسانفسی کے اس دور میں ہم کہیں بہت دور تو نہیں نکل گئے؟؟؟ رشتوں کو مضبوط کرنے کے بجائے کمزور تو نہیں کر دیا؟ سوچئے گا ضرور؟؟؟

تنظیم فاطمہ ریسرچ اسکالر بنارس ہندو یونیورسٹی، اتر پردیش

تبسم فاطمہ کے افسانوں کا تنقیدی جائزہ

تبسم فاطمہ کا نام اردو ادب کے ممتاز ترین افسانہ نگاروں کے درمیان آتا ہے۔ اردو ادب کی معروف شاعرہ اور افسانہ نگار تھیں۔ ان کی پیدائش 1960 میں آرا بہار میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم آرا اور پٹنہ میں حاصل کی۔ انہوں نے نفسیات میں ایم اے کیا تھا۔ اردو کے مشہور فکشن نگار مشرف عالم ذوقی کی شریک حیات تھی۔ شادی کے بعد یہ دہلی میں رہائش پذیر ہوئی۔

انھونے ہندی اور اردو دونوں زبان میں لکھا۔ تبسم فاطمہ افسانہ نگار، نقاد، صحافی، مترجم اور فلم ساز بھی تھیں۔ انھوں نے اردو اور ہندی میں ۲۰ سے زیادہ کتابوں کا ترجمہ کیا ہے۔ دور درشن اور دوسرے ٹی وی چینلز کے لیے ادبی پروگرام بنائے۔ انھونے مختلف رسالوں کے لیے کالم لکھے۔ انہیں بہت سارے ادبی ایوارڈ ملے۔ انہیں ہیومن رائٹس کے خصوصی ایوارڈ سے بھی نوازا گیا۔ ان کے افسانے مختلف رسالوں میں شائع ہوئے۔ ان کے افسانے اپنے موضوع اور زبان و بیان کی وجہ سے ہمیشہ یاد رکھے جائیں گے۔ انہوں نے سادہ الفاظ و بیان کے استعمال سے اپنے افسانے کو ہر دل عزیز بنایا۔

'لیکن جزیرہ نہیں'، 'ستاروں کی آخری منزل' اور 'سیاہ لباس' ان کے افسانوی مجموعے ہیں۔ ان کا شعری مجموعہ 'تمہارے خیال کی آخری دھوپ" نام سے شائع ہوا۔ اپنے شوہر مشرف عالم ذوقی کی وفات کے بعد وہ ایک دن بھی نہ جی سکیں، دوسرے دن ہی دنیا کو الوداع کہہ کر اپنے خالق حقیقی سے جا ملیں۔ ان کا شمار اردو کے اہم افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔

انہوں نے اپنے افسانوں میں دور حاضر کے مسائل کی عکاسی کی ہے۔ ان کے افسانوں میں زندگی کی تلخ حقیقتوں کو پیش کرنے کی کامیاب کوشش نظر آتی ہے۔ انہوں نے اپنے آس پاس کے مظلوم استحصال زدہ عورت کو اپنی کہانیوں میں پیش کیا ہے۔ عورت اور عورت کے مسائل ان کا خاص موضوع رہا۔ ان کے افسانے کی عورت کمزور نہیں ہوتی بلکہ انقلابی شخصیت کی مالک ہوتی ہے۔ دراصل تبسم فاطمہ عورت کو کمزور نہیں مانتی۔ انہوں نے اپنے افسانوں میں افسانوی مجموعہ 'ایک جزیرہ نہیں' کے تعارف میں صاف الفاظ میں لکھا ہے کہ وہ عورت کو کمزور نہیں مانتی وہ لکھتی ہیں۔۔۔

"میں بالکل نہیں مانتی کہ عورت مجبور ہے۔ وہ ستائی ہوئی ہو سکتی ہے مگر ہاری ہوئی نہیں۔"

انہونے اپنے افسانے جرم میں اپنے کرداروں کے ذریعہ عورتوں کی نفسیاتی کیفیات کو پیش کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ دیپا منیش سے محبت کرتی ہے۔ شادی سے پہلے منیش بھی دیپا سے بہت محبت کرتا تھا لیکن جیسے جیسے دیپا کے جسم کی خوبصورتی اسکے موٹاپے کے پیچھے چھپتی جاتی ہے ویسے ویسے منیش کی محبت میں بھی اسے کمی نظر

آنے لگتی ہے۔ منیش دیپا سے ہمیشہ اس کے جسم پر آئی ہوئی خامیوں کا سوال کرتا۔ منیش کہتا ہے۔۔۔۔۔

''دیپا۔۔۔۔ تم یہاں۔۔۔۔ یہاں اور یہاں سے بدصورت ہو رہی ہو۔ تمہارا پیٹ کافی نکل گیا ہے۔ چہرے پر جھائیاں پڑ رہی ہیں۔"

عورت ہونے کی وجہ سے عورت کی نفسیات سے بخوبی واقف تھیں۔ انہیں عورت کے دکھ درد کا احساس تھا۔ اپنے افسانوں میں اُنہوں نے عورت کی ذہنی کیفیت کو بڑی خوبصورتی سے پیش کیا ہے۔ عورتوں کی ذہنی کشمکش کو اس انداز میں پیش کیا ہے کہ کردار کی نفسیاتی کیفیت قارئین کے دل و دماغ میں اتر کر ایک ذہنی انقلاب برپا کر دیتی ہے۔

"عورت۔ اسے خود سے شدید نفرت کا احساس ہوا۔ ایسا کیوں ہے؟ عورت ہر معاملے میں زندگی کے ہر موڑ پر۔ تقدس کی گرد جھاڑتے ہیں چت کیوں ہو جاتی ہے۔ ایکدم سے چت اور ہاری ہوئی۔ مرد ہی جیتتا ہے۔ عورت چاہے جتنی بڑی کیوں نہ ہو جائے۔ اندرا گاندھی۔ مارگریٹ تھیچر۔ سے لے کر عورت کی عصمت کہاں سو جاتی ہے۔"(افسانہ- جرم)

" کچن کے پاس ذرا ہٹ کر جو بیسن ہے۔ وہاں اس نے بڑا سا آئینہ لگا رکھا ہے۔ اپنے سراپا کو روزانہ دیکھنے کے لئے۔ بدن کی ان برائیوں کو جاننے کے لیے۔ جسے شادی کی صرف چند سالوں بعد منیش کی آنکھوں میں بارہا محسوس کیا ہے۔ آئینہ کے سامنے کھڑی ہو کر وہ عجیب عجیب حرکتیں کرتی ہے۔ اپنے ہاتھ پاؤں پر چڑھنے گوشت کو بار بار چھو کر دیکھتی ہے۔ وہ فربہ ہونے لگی ہے۔ اور منیش لحہ لحہ اس سے دور ہوتا جا رہا ہے۔"(افسانہ جرم)

وہ اپنے افسانوں کے ذریعہ معاشرے میں تبدیلی لانا چاہتی تھی۔ عورتوں کے مسائل کو اپنا پسندیدہ موضوع بنایا۔ وہ اپنے افسانوں میں عورت کو مرد کے مقابلے میں کھڑا کرتی ہیں۔ افسانے حجاب میں زرینہ حجاب اور دوسری بندشوں کو توڑ کر اپنی زندگی کا فیصلہ خود کرتی ہے۔ اپنے خاندان کے اصولوں سے درگزر کر کے اپنی آگے کی تعلیم مکمل کرتی ہے اور اپنی پسند کے لڑکے سے اپنی شرائط پر شادی کرتی ہے۔ زرینہ ایک انقلابی شخصیت کی مالک ہے۔ اسے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ اسے دنیا کے کتنے تانے سننے کو ملیں گے۔ اُس کا یہ ماننا ہے کی اُس کی زندگی کا فیصلہ کسی دوسرے کو نہیں بلکہ خود اُسنے کرنا چاہیے۔ وہ ایسے اصولوں سے درگزر کرتی ہے جو اسے قید کر لیں۔

"سامنے ابا کھڑے تھے۔ بڑا بھائی جنید بھی، پہلی بار میں نے کسی کی پرواہ نہیں کی تھی۔ حجاب اماں کی طرف اچھال دیا تھا۔

'مجھے نجمہ باجی نہیں بننا ہے'

سامنے ابا اور جنید کی غصے سے گھورتی آنکھوں کی مجھے ذرا بھی پرواہ نہیں تھی۔ شاید بکھرتے ہوئے، بڑے ہوتے ہوئے یہ پہلا فیصلہ تھا، جو میں نے اپنے پورے ہوش و حواس میں لیا تھا۔ میں یہ دیکھنے کے لئے بھی نہیں ٹھہریں کے اماں ابا اور جنید میں کیا باتیں چل رہی تھیں یا وہ مجھے لے کر کس نتیجے پر پہنچنے کی کوشش کر رہے تھے۔

لیکن پہلی بار سینے پر رکھا ہوا 'سلیٹ' مجھ سے الگ ہوا تھا۔"

سماج میں پھیلی برائیوں پر بھی ان کی گہری نظر تھی۔ افسانہ "سیاہ لباس" میں انہوں نے معاشرے میں پھیلی ہوئی گندگی کو بے نقاب کیا ہے۔ صحیفہ جس کالج میں

پڑھتی ہے وہاں کے ایک پروفیسر صحیفہ کو گندی نظروں سے دیکھتے ہیں۔ صحیفہ کا رویہ ان دنوں کچھ ٹھیک نہیں لگ رہے تھا۔ اس کی ماں کو اس بات کا احساس تھا کہ صحیفہ کے ساتھ کچھ غلط ہو رہا ہے۔ ماں سوچتی ہے کہ شاید کالج کے کسی لڑکے سے صحیفہ کو محبت ہے اور اس محبت میں اُس نے کوئی غلط قدم اٹھالیا ہے۔ ایک دن صحیفہ بہت زیادہ عاجز آ کر اپنی ماں کو میسج کرتی ہے کہ وہ اُن سے کوئی بات کرنا چاہتی ہے۔ صحیفہ کی ماں بہت زیادہ پریشان ہوتی ہے یہ سوچ سوچ کر کہ کیا بات ہوئی ہوگی۔ صحیفہ گھر آتی ہے تو اپنی ماں سے کہتی ہے کہ اسے وحشی نظروں سے بہت ڈر لگتی ہے۔ وہ کہتی ہے کہ لڑکوں سے نہیں بلکہ بوڑھوں سے ڈر لگتی ہے۔ صحیفہ کی ماں اسے کالج چھوڑنے کو کہتی ہیں لیکن صحیفہ کالج چھوڑنے کی بجائے ڈٹ کر حالات کا سامنا کرتی ہے۔ اور کہتی ہے۔۔۔۔۔

" گھر سے باہر نکلو تو جیسے جسم پر ہزار چبھتی ہوئی آنکھیں ہوتی ہیں۔ پہلے سوچا تھا کالج چھوڑ دوں گی۔ مگر نہیں۔ اب سوچ لیا ہے۔ کہاں جاؤں گی؟ کسی دوسرے کالج میں؟ کیا وہاں نارائن راؤ جیسے ٹیچر نہیں ملیں گے؟ اپنے سیاہ دانتوں سے، اپنی ہوس بھری نظروں سے آپ کو دیکھتے ہوئے۔"

تبسم فاطمہ نے اپنے افسانوں کے کرداروں کے مکالمے کے ذریعے ان تمام معصوم لڑکیوں کی تکلیف کو قارئین کے سامنے پیش کرنے کی کوشش کی ہے، جو ان حالات سے روز دو چار ہوتی ہے۔ جنہیں آئے دن لوگوں کی وحشی نظروں سے خود کو بچانا پڑتا ہے۔ ان کی اپنے کردار سے ہمدردی صاف نظر آتی ہے۔ یہ اپنے افسانوں سے عورت کو انقلابی پیغام دیتی ہے۔ ہمیشہ عورت کو مرد خود سے کمتر سمجھتے ہیں۔ وہ اپنے افسانے میں ہمارے معاشرے کی عورتوں کے ساتھ انصاف کرتی ہیں اور اسے مرد کے مقابلے میں پیش کرتی ہے۔ ان کے افسانے کی یہ خصوصیت ان کے افسانے کو ہر دل عزیز بناتی ہے۔

"لیکن جزیرہ نہیں" میں عورت کے دکھ اور تکلیف کو بیان کیا ہے۔ انہوں نے اس بات کو موضوع بحث بنایا ہے کہ عورت اپنے مرد کی جتنی خدمات انجام دے لے، لیکن ذرا سی خامی یا کمی ہونے پر مرد اس کی ساری محبت، خلوص اور خدمت کو بھلا دیتا ہے۔ سرمد نے تبو کے اتنے سالوں کے پیار اور خلوص کو اتنی جلدی بھلا دیا جس کا تبو کو کبھی اندازہ نہیں تھا۔ عاشی کے گمشدہ ہو جانے کے بعد سرمد اور تبو کا گھر بہت سونا ہو گیا تھا۔ تبو اور سرمد دونوں اپنے بیٹے عاشی سے بہت پیار کرتے تھے۔ ایک دن عاشی کو کسی نے اسکول سے اغواہ کر لیا۔ یہ خبر سن کر تبو کے پیروں تلے زمین کھسک گئی۔ وہ اپنے بچے کو ہر جگہ تلاش کرتی۔ عاشی کے جانے سے تبو کو بھی اتنا ہی غم تھا جتنا سرمد کو۔ تبو سے بھی گھر کی خاموشی اور اُداسی نہیں دیکھی جاتی۔ لیکن سرمد نے تو تبو اور تبو کی محبت کا بالکل بھی خیال نہیں کیا۔ ایک دن سرمد کے پرانے کاغذات ڈھونڈھتے ہوئے تبو کو سرمد کی ڈائری ملی۔ ڈائری میں جو لکھا تھا، اسے اس کی امید نہ تھی۔

"ابا کی خاموشی اور اس گھر کا سونا پن اب مجھ سے دیکھا نہیں جاتا۔ تبو اب اس گھر کے سونے پن کو دور کرنے کے لئے کوئی عاشی مجھے نہیں دے سکتی۔ اس لیے میں نے سوچ لیا ہے کہ۔ آنسوؤں میں اچانک سارے الفاظ دھندلانے لگے۔ ڈائری ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑی۔"

انھوں نے اس افسانے میں عورت کو ایک جزیرہ کہا ہے جس پر کوئی اجنبی کچھ دیر آرام کرتا ہے۔

"عورت تو دور سمندر کی کسی لامتناہی سرے پر بسا ہوا جزیرہ ہوتی ہے۔ بس کسی نووارد کی طرح کوئی مرد ذرا دیر وہاں آ کر آرام کرنا چاہتا ہے۔ اس سے زیادہ اور کیا رشتہ ہوتا ہے مرد کا عورت سے۔"

تبسم فاطمہ

ممتاز ترین ادیبہ اور شاعرہ ہیں۔ انہوں نے اپنے قلم سے اردو ادب کی ناقابل فراموش خدمات انجام دی ہیں۔ یہ اردو ادب میں نمایاں حیثیت رکھتی ہیں۔ ان کے انتقال سے اردو ادب نے اپنا بیش بہا سرمایہ کھو دیا ہے۔ اردو ادب ایک بہترین افسانہ نگار سے محروم ہوگئی ہے۔ ہم اللہ سے ان کی مغفرت کی دعا کرتے ہیں اور یہ بھی دعا کرتے ہیں کہ اللہ ان کے لواحقین کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

چراغ

نیاز جیراج پوری

اپنی خود مختاری کی خوشیاں منانے کے لئے
فخر سے ستّر چراغ اب تک جلائے جا چکے
بیشتر محروم رنگوں سے رہے اور رہ گئے
آج کل پرسوں کے جو خاکے بنائے جا چکے
المیہ اِس کو کہا جائے یا بیماری کوئی
ذہن و دِل کے کالوں کو اِس روشنی سے بَیر ہے
اِن کے ہاؤ بھاؤ سے یہ بات ہوتی ہے عیاں
اِن کی نظروں میں تو جو اپنا ہے وہ بھی غَیر ہے
جانے کِتنی آنکھوں کے آنسو ابھی سُوکھے نہیں
جانے کِتنے چہروں پر ہی چھائی ہے پژ مُردگی
جانے کِتنے ہاتھوں میں ہیں داغ چھالوں کے ابھی
جانے کِتنے لوگ ہی سو جایا کرتے بھوکے ہی
زِندگی کی دُھوپ میں حالات سے لڑتے ہُوئے
سائباں سے ہیں ابھی محروم کِتنے لوگ ہی
جانے کِتنے جِسم کپڑوں کو ترستے رہتے ہیں
دُور جانے کِتنے بھوکوں سے ہے روٹی آج بھی
بھُول سے معصوم بچّے سوچ میں ہیں مُبتلا
آگے بڑھنے کے لئے مِلتا اِنہیں رستہ نہیں
کرتے ہیں مزدوری یہ بھی گھر چلانے کے لئے
حیف! صد حیف !! اِنکی قِسمت میں کوئی بستہ نہیں
کارخانوں اور مِلوں میں روزی روٹی کے لئے
دِن تو دِن ہیں دُور جو رہتے ہیں اپنی راتوں سے
گھولتے رہتے کثافت اور دُھواں یہ سانسوں میں
آہ ! کتنے مِلتے جُلتے ہیں یہ زِندہ لاشوں سے
غور و فکر و تجزیہ اور کوششوں کے باوجود
ہیں دِلاسے اور وعدے کھوکھلے اب بھی بہت
کچھ نہیں آتا سمجھ میں ہو گا کیا اِس دیش کا
ہاں نہیں کے درمیاں ہیں فاصلے اب بھی بہت
ہم جہاں تھے ہم وہیں ہیں یہ بھی کہہ سکتے نہیں
ہے ضروری دیش پریم اور دیش بھکتی کے لئے
ہم رہیں رنجش عداوت بُغض و نفرت بھول کر
ہوں خزاں میں بھی نمایاں رنگ ساون کے نیاز
کاش ! دیکھیں قومی یکجہتی کے جھولے جھول کر

تصانیف شبلی کے تراجم

ماہنامہ صدائے شبلی میں ہر ماہ ادارے کی طرف سے کتاب پر تبصرہ کیا جائے گا، اس لئے مصنفین، مولفین اور مرتبین سے گزارش ہے کہ وہ تبصرے کے لئے دو عدد کتابیں ضرور ارسال کریں۔ (ادارہ)

ڈاکٹر محمد طارق ایوبی

نام کتاب :	تصانیف شبلی کے تراجم
مصنف:	ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی
ناشر:	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی
صفحات:	۲۲۴
قیمت:	۴۰۰ روپیہ
ملنے کے پتے:	مکتبہ دار المصنفین اعظم گڑھ، مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ دہلی۔

تاریخ پر ایک سرسری نظر ڈالیے تو آپ کو بے شمار اہل علم واصحاب قلم کے نام آسمان پر جگمگاتے نظر آئیں گے، لیکن ان میں یہ امتیاز بس کسی کسی کو ہی حاصل ہوا کہ اس کی جگمگاہٹ کے آگے دوسروں کی روشنی پھیکی پڑ گئی، بقاودوام اور افادیت کا تسلسل بعض بعض کو ہی حاصل ہوا، کچھ ہی لوگ ایسے عبقری نظر آئیں گے جن کی عبقریت عالمی سطح پر مسلّم ہوگی، جن کی افادیت میں حدود وثغور اور لسانی رکاوٹیں مانع نہیں نظر آئیں گی، علامہ شبلی نعمانی ان ہی متعدد عبقری لوگوں میں تھے جن کی افادیت کا سلسلہ آج بھی جاری ہے اور انشاء اللہ جاری رہے گا، بلکہ شبلی سے نسبت رکھنے والوں کی بھی زندگی کا سامان ہوتا رہے گا۔ ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی ان ہی لوگوں میں ہیں جنھوں نے اپنے لئے بطور دائرہ عمل ''شبلیات'' کا انتخاب کیا، انتخاب تو بہت سے لوگ کرتے ہیں لیکن موصوف کا امتیاز یہ ہے کہ وہ شبلی شناسی میں سنگ میل کی حیثیت اختیار کر گئے، بلا مبالغہ اور بلا خوف تردید یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ نقوش وآثار شبلی اور باقیات شبلی کی حفاظت واشاعت کا سہرا اگر علامہ سید سلیمان ندویؒ کے سر بندھتا ہے تو شبلی شناسی کی راہ ہموار کرنے اور نقوش وآثار شبلی پر تحقیق کرنے والوں کے لیے دفتر کے دفتر تیار کرنے کا سہرا ڈاکٹر الیاس اعظمی کے سر بندھتا ہے، میں اکثر کہتا ہوں کہ کام کرنے والے کہیں بھی بیٹھ کر کام کر لیتے ہیں، چنانچہ الیاس اعظمی بڑی بڑی دانش گاہوں میں جلوہ افروز محققین اور پروفیسرز کے لئے نمونہ عمل اور قابل تقلید شخصیت بن گئے ہیں، انھوں نے واقعی اپنے دائرہ عمل میں اتنا تحقیقی کام کر لیا ہے جو احساس رکھنے والوں کے لیے قابل رشک ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ شبلی ''شبلی'' تھے، اپنے ہم عصروں میں ہی نہیں تاریخ میں بھی ممتاز ومنفرد شخصیت کے مالک تھے، شبلی کا زمانہ تصنیف وتالیف بہت مختصر رہا، بلکہ عمر بھی نسبتاً کم ہی پائی لیکن ان کی علمی خدمات، افکار وموضوعات کا تنوع، تحقیق کی وسعت وگیرائی ایک طرف عہد قدیم کی یاد دلانے کے لیے کافی ہے تو دوسری طرف عہد جدید میں نئے طرز ومنہج کی بنیاد۔ بالکل بجا ہے کہ برصغیر میں عہد جدید کے معلم اول شبلی ہیں۔

شبلی شناسی کے سفر میں کئی کامیاب کوششیں پیش کرنے کے بعد مولف موصوف نے ''تصانیف شبلی کے تراجم'' کو موضوع بنایا اور فی الحقیقت موضوع پر تحقیق کا حق ادا کر دیا، تراجم کی کثرت ووسعت سے کسی مصنف کی عظمت و مقبولیت وافادیت اور اس کے دائرہ فکر کی وسعت کا پتہ چلتا

ہے، اب سے پہلے کتنے لوگ شبلی کی اس ہمہ گیریت اور عالمیت سے واقف تھے؟ اور واقف تھے تو کس حد تک واقف تھے؟ تصانیف شبلی کا ترجمہ کوئی آسان کام تو نہیں! ترجمہ کے لیے علم چاہیے، زبان چاہیے، مصنف کی زبان اور ترجمے کی زبان سے واقفیت چاہیے، مصنف کی تہذیب اور ترجمے کی زبان سے وابستہ زبان کی تہذیب اور دونوں تہذیبوں کے ساتھ مصنف کے عہد کے ماحول و مزاج سے واقفیت چاہیے، تب کہیں جا کے کوئی ترجمہ کامیاب ہوتا ہے کیونکہ ایک ترجمے میں صرف کتاب نہیں منتقل ہوتی بلکہ اس کتاب سے متعلق زبان و تہذیب اور زبان کا ورثہ منتقل ہوتا ہے، شبلی کی عبقریت، شبلی کا طرز، شبلی کی زبان، شبلی کا اسلوب اور اُس کا ترجمہ! یہ شبلی کی مقبولیت وافادیت تھی جس نے دنیا کے اہل علم کو تصانیف شبلی کے تراجم کی طرف متوجہ کیا، میں اکثر کہتا تھا ترجمہ نگاری خود بڑی علمی خدمت ہے، بشرطیکہ صرف پیٹ پالنے کے لئے ترجمہ نہ ہو، بلکہ علمی میراث کو منتقل کرنے اور علمی روایت کو آگے بڑھانے کے لئے ترجمہ کیا جائے، اب تو اردو سے وابستہ تحقیق وتصنیف کا میدان خالی خالی نظر آتا ہے، موضوعات میں تنوع اور جدت ناپید نظر آتی ہے، بحث وتحقیق کا معیار دن بدن پست ہوتا جارہا ہے، سہولت وکسل مندی نے تلاش وجستجو کی اسپرٹ ہی ختم کردی ہے، اس صورت حال میں میرا خیال تھا کہ عربی و انگریزی کی معیاری تحقیقات کا اگر اچھا اردو ترجمہ ہی فراہم کیا جاتا رہے تو اردو کا مکتبہ ہمہ وقت مالا مال رہے گا۔

میرے اس خیال کو علامہ شبلی کے اس وقیع شہ پارے نے بے حد طاقتور بنا دیا بلکہ سند عطا کردی جسے الیاس اعظمی صاحب نے ابتدا میں ہی لسان الصدق کے حوالے سے نقل کیا ہے، علامہ شبلی نے فرمایا تھا: ''میں تو ترجمہ کو اصلی علمی خدمات سمجھتا ہوں بلکہ ان شاء اللہ اس کا ایک باضابطہ سررشتہ قائم کروں گا'' یہ حقیقت جن اہل قلم کے پیش نظر تھی انہوں نے خود علامہ کی تصانیف کو متعدد ملکی وغیر ملکی زبانوں میں منتقل کیا جن کی تفصیلات زیر نظر کتاب میں ڈاکٹر الیاس اعظمی نے بڑی عرق ریزی سے جمع کی ہیں اور سچ یہ ہے کہ جتنی تفصیلات انھوں نے جمع کی ہیں وہ واقعی وہی شخص کرسکتا ہے جسے علم وتحقیق سے عشق ہو، جو اسلاف کی روایات کا امین و پاسبان ہو، جسے ہمہ وقت تراث علمی کی حفاظت واشاعت کا خیال ستاتا ہو۔

زیر نظر کتاب شبلی شناسی کے باب میں الیاس اعظمی کی انیسویں کاوش ہے جو بجا طور پر لائق مبارکباد اور قابل داد و تحسین ہے، ''شبلی شناسی کی نئی منزلیں'' کے عنوان سے آغاز کتاب میں ڈاکٹر معین الدین عقیل کا مضمون مصنف کو بجا طور پر خراج عقیدت پیش کرتا ہے، ڈاکٹر سفیر اختر کا یہ کہنا بجا ہے کہ ''یکے بعد دیگرے اپنی تصنیفات کے ذریعہ ڈاکٹر محمد الیاس اعظمی نے اپنے لیے جو مقام پیدا کیا ہے وہ بے مثل ہے''۔

یہ کتاب دو ابواب پر مشتمل ہے، پہلے باب میں ''تصانیف شبلی کے تراجم'' کی تفصیلات سے واقف کرایا گیا ہے، اس باب میں مصنف نے تصانیف شبلی کے ۱۸ زبانوں میں ۱۴۰ تراجم کا تذکرہ کیا ہے، بعض زبانوں میں کسی ایک کتاب کا ترجمہ ہوا ہے اور بعض میں کئی کئی کتابوں کا ترجمہ کیا گیا ہے اور بعض زبانوں میں بعض کتابوں کا الگ الگ ترجمہ بھی شائع ہوا ہے، مصنف نے اس باب میں جس قدر تفصیلات بھی دستیاب ہوسکی ہیں وہ سب جمع کر دی ہیں، کس کتاب کے کتنی زبانوں میں ترجمے ہوئے؟ کن کن لوگوں نے ترجمہ کیا؟ پہلا ایڈیشن کب شائع ہوا؟ کتنے ایڈیشن چھپے؟ کتاب کے مطالعہ سے نہ صرف ان تمام

سوالات کے جوابات ملتے ہیں بلکہ اندازہ ہوتا ہے کہ مصنف محترم نے حتی المقدر اور قابل تشفی معلومات جمع کرنے کی سعی مشکور کی ہے، معدود مقامات پر ہی تشنگی کا احساس ہوگا، یا یہ مصنف کی طرف یہ معذرت نظر آئے گا کہ اس سلسلہ میں اس سے زیادہ تفصیلات نہ مل سکیں۔

مصنف نے سب سے پہلے تصانیف شبلی کے اردو زبان میں ترجموں کا تذکرہ کیا ہے پھر انگریزی، بنگالی، پشتو، تاجک، ترکی تمل، سندھی، عربی، فارسی، فرنچ، کشمیری، کنڑ، گجراتی، گوجری، مراٹھی، ملیالم اور ہندی تراجم کے متعلق تفصیلات درج کی ہیں، یہ بات واقعی حیرت انگیز ہے کہ شبلی کی بعض کتب کے اتنے ترجمے ہوئے کہ تاریخ تراجم میں اس کی مثال ملنا مشکل ہے، مثلاً سیرت النبی کے مکمل اور مختص تراجم کی تعداد ۳۵ ہے، الفاروق کے ۳۰ ترجمے ہوئے ہیں، شعرالعجم کے ۱۸ ترجمے ہوئے ہیں۔

دوسرے باب میں تصانیف شبلی کے مختلف زبانوں کے ۹۲ مترجمین کا مختصر اور جامع تعارف کرایا گیا ہے، ظاہر ہے کہ ان شخصیات کا تعارف بھی ایک بڑا کام ہے، کیوں ان سب کے درمیان زبان و مکان کا بعد وتفاوت ہے، سب کا تعلق الگ الگ ملکوں اور زمانوں اور زبانوں سے ہے، ان ۹۲ مترجمین کا تعلق چودہ ملکوں اور ۱۸ زبانوں سے ہے، لیکن الیاس اعظمی صاحب نے نہایت مختصر و جامع تعارف کچھ اس طرح کرایا ہے کہ مترجم کی شخصیت کا علمی مقام ومرتبہ سمجھنے میں دیر نہیں لگتی، اس باب میں بھی ڈاکٹر صاحب نے حتی المقدور تلاش وتحقیق کی ہے، پھر بھی متعدد شخصیات کے متعلق ان کو بالکل بھی تفصیلات نہ حاصل ہوسکیں، ظاہر ہے کہ بہت سی تفصیلات دور دراز کے اسفار اور ذاتی ملاقاتوں کی متقاضی ہوتی ہیں، بعض مترجمین کی تفصیلات نہ مل پانا باعث تشویش نہیں، لیکن اگر ترجمہ کرنے والی شخصیت نادر شاہ جیسے مشہور بادشاہ کی ہمشیرہ ہو تو پھر تفصیلات شامل کتاب نہ ہونا یا معلومات نہ مل پانا باعث تشویش بھی ہے اور لائق تحقیق بھی، مصنف نے ان کے تذکرے میں خود ہی لوگوں کو اس جانب متوجہ کیا ہے۔

سچی بات یہ ہے کہ زیر نظر کتاب صرف مطالعات شبلی سے متعلق ایک تاریخی دستاویز کی صورت میں ہی سامنے نہیں آئی ہے بلکہ اہل علم اس کتاب کے ذریعہ بہت سی دیگر شخصیات اور ان کی خدمات اور ان کے تذکرہ سے بھی واقف ہوں گے، اہل تحقیق کے لیے یہ کتاب باعث تسکین ہوگی اور شبلیات سے خاص تعلق رکھنے والوں کے لئے تو ہے ہی انمول تحفہ، اردو دنیا میں بالخصوص مطالعات شبلی کے حوالے سے یہ منفرد کام ہے۔

شبلی شناسی کے سفر میں الیاس اعظمی کا عہد زمانی اعتبار سے وہ قرار پایا جب شبلی صدی تقریبات کی دھوم دھام تھی لیکن شبلی شناسی کی نئی منزلوں کی تلاش وجستجو، نئی دریافت، مطالعات شبلی کے ابعاد وجہات پر بحث وتحقیق اور اعلیٰ علمی کاوشوں کے سبب وہ بعض اعتبار سے اولیت حاصل کر گئے اور بعض جہتوں سے فوقیت لے گئے، اہل علم نے اگر انھیں داد وتحسین سے نوازا تو بجا! نئے محققین اور علمی دنیا کے نو واردوں کو الیاس اعظمی سے سبق حاصل کرنا چاہیے اور کچھ نہیں تو کم از کم تصانیف شبلی کی طرح مشہور ہندوستانی علماء کی تصانیف کے تراجم کی ایک سیریز تیار کر دینا چاہیے، خدا تعالی مصنف محترم کی خدمات کو قبول و دوام بخشے۔

اردو ورلڈ سمیٹ پوسٹر ریلز، اردو زبان وادب کے خدمت گزاروں کے ہاتھوں میں

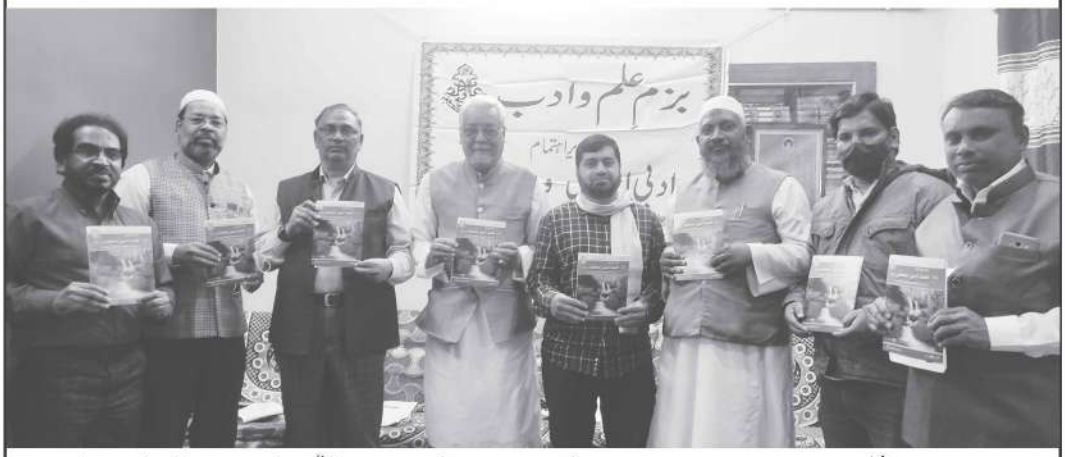

ماہنامہ ''صدائے شبلی'' حیدرآباد کے ماہِ دسمبر ۲۰۲۱ء کے تازہ شمارہ محسن خان، ایڈیٹر ڈاکٹر محمد محامد ہلال اعظمی، ڈاکٹر محمد آصف علی، ڈاکٹر م ق سلیم
ڈاکٹر محمد غوث، ڈاکٹر مظفر علی ساجد، ظہور ظہیر آبادی کے ہاتھوں میں

DR. S.J HUSSAIN
MD (Unani)
Former director Incharge
Central Research Institute Of Unani Medicine
Govt of India

website: www.unanicentre.com
Email:syedjalilhussain@gmail.com
jaleel_hussain@yahoo.com

Dr. Jaleel's

UNANI CENTER FOR CARDIAC

یونانی سینٹر فار کارڈیک کیر

Consultation Time
Morning:9:00 am to 3:00 pm-Evening:7:00 pm to 9:30 pm
(Friday Morning and Sunday Evening Closed)

Cell:
+91 8142258088
+91 7093005707

Adress -: No: 8-1-332/3/B-69, RoadNo 1(A)Arvind Nagar Colony
Tolichowk Hyderabad - 500008 T.S India

MADRASA ISLAMIA NAJMUL ULOOM
Shahi Hills, Near Masjid Noor Ali, Shaheen Nagar, Hyderabad.
SHIBLI INTERNATIONAL
EDUCATIONAL AND CHARITABLE TRUST

مدرسہ اسلامیہ نجم العلوم
شاہی ہلز نزد مسجد نور علی، شاہین نگر، حیدرآباد
Regd No: 180/2016

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ.....گرامی قدر محترم! امید ہے کہ آپ اپنے متعلقین کے ساتھ بخیر وعافیت ہوں گے

حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم ہے خَیْرُکُم مَن تَعَلَّم القُرآن وَعَلَّمَہ ۔تم میں سے بہترین انسان وہ ہے جو قرآن سیکھے اور سکھائے ۔اس حدیث سے علم اور قرآن علم کی اہمیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔اسی علم کی نشر واشاعت کے لئے **مدرسہ اسلامیہ نجم العلوم** شاہی ہلز شاہین نگر حیدرآباد میں ۱۵؍جنوری ۲۰۱۷ء کو قائم کیا گیا تا کہ امت مسلمہ کے نونہالان زیور علم سے آراستہ ہوں اور ملک وملت کی خدمت میں وقف ہوجائیں۔اللہ رب العزت ان مقاصد میں کامیابی عطا فرمائے۔آمین یارب العلمین۔

مدرسہ ہذا اور ٹرسٹ کی کوئی مستقل آمدنی نہیں ہے۔جملہ اخراجات کی ادائیگی اہل خیر حضرات کے تعاون سے ہوتی ہے۔ٹرسٹیوں کے مشورے سے ٹرسٹ اور مدرسہ کے لیے تین سو ستائیس (327) رگز زمین شاہی ہلز شاہین نگر میں خریدی جاچکی ہے،جس کی مجموعی قیمت چھتیس لاکھ ستّر ہزار تھی۔الحمدللہ اہل خیر کے تعاون سے بیشتر رقم ادا کردی گئی ہے۔ماشاءاللہ تعمیری کام جاری ہے۔الحمدللہ پہلا چھت پڑچکا ہے،مزید مراحل کے لیے اہل خیر حضرات سے گذارش ہے کہ نقد اور اشیاء سے تعاون فرما کر شکریہ کا موقع عنایت فرمائیں۔نوازش ہوگی۔

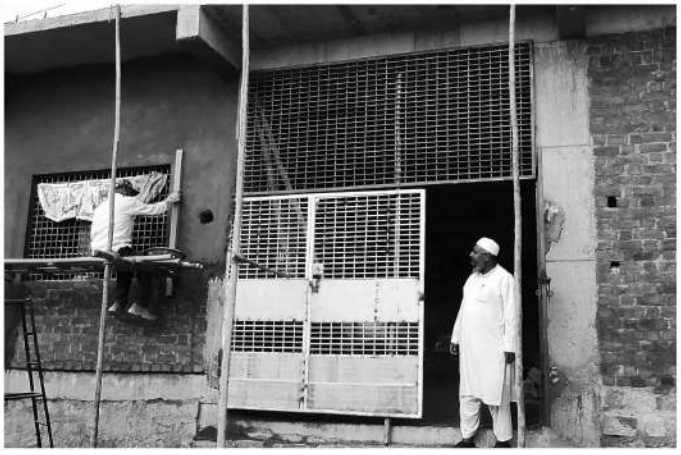

Bank Name: IDBI CURRENT ACCOUNT
A/c Number: 1327104000065876
A/c Name: SHIBLI INTERNATIONAL EDUCATIONAL AND CHARITABLE TRUST
IFSC Code: IBKL0001327. Branch: Charminar

حافظ وقاری مفتی ڈاکٹر محمد محامد ہلال اعظمی خطیب مسجد عالیہ، بانی وناظم مدرسہ ہذا چیرمین شبلی انٹرنیشنل ایجوکیشنل ٹرسٹ حیدرآباد

Google Pay: **8317692718** WhatsApp: **9392533661**

Urdu Monthly
SADA E SHIBLI
Hyderabad

Jan. 2022

RNI: TELURD/2018/77022
ISSN: 2581-9216

Rs. 20/-

مجتبیٰ ٹکسٹائلس

MUJTABA
TEXTILES

#20-4-20/6/1, 20-4-20/7/5 & 7/6, Punch Mohalla, New Laad Bazar, Khilwath, Hyderabad. T.S. India

Ph: +91 6281040896 - Email: mujtabatextiles18@gmail.com - Web: www.mujtabatextiles.com

Follow us on facebook: https://www.facebook.com/mujtaba.textiles.1

Editor, Printer, Published & Owned by Mohd. Muhamid Hilal
Printed at Daira Electric Press, #22-8-143, Chatta Bazar, Hyderabad. 500 002.
Published at #17-3-352, B1, 2nd Floor, Bafana Complex, Dabeerpura, Hyderabad - 23, T.S
Cell: 9392533661, 8317692718, Email: muhamidhilal@gmail.com